ابنِ بطوطہ کے ملک

کل اور آج

تالیف: مائیکل ایلیٹ

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل

ابن بطوطہ کے ملک

کل اور آج

تالیف: مائیکل ایلیٹ

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل بکس

آر-بی5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

فہرست

1۔	جہاں گرد	رضا اصلان	05
2۔	اعتدال پسند اسلام کا عروج	بوبی گھوش۔قاہرہ	11
3۔	اس کے لئے ایک پوری بستی قربان کرنی پڑتی ہے	کارل وِك۔استنبول	21
4۔	تاریخی روایات کے شہر طنجہ کی کشش	لیلیٰ لالامی	27
5۔	صومالیہ کے سمندری بھیڑیے	ایلکس پیری۔گلکایو	31
6۔	ایک امارت کی تکمیل کا سفر	مائیکل شومن۔دبئی	43
7۔	رومان کے تعاقب میں	ایرین بیکر۔ریاض	49
8۔	وقت کی ریت اور پانی	اشان تھرور	59

9۔	ایک نئی گریٹ گیم	حنا بیچ۔اتی راتو	61
10۔	بخارا سے اخراج	مائیکل شمان	71
11۔	تاریخ ایک تھالی میں	آنیا سیزادلو۔بیروت	75
12۔	ایک عقیدہ، کئی رخ	زہیر عبدالکریم	79
13۔	بنیاد پرستی کے رنگ	جیوتی تھوٹم۔کوزہی کوڈے	83
14۔	سپین میں شناخت کا بحران	لیزاایبنڈا۔غرناطہ	89
15۔	بھارتی مسلمانوں کا بحران	ایرین بیکر	99
10۔	کئی زمانوں کے سمندری مسافر	پکو آئر۔دبئی	109
11۔	ہانگژو کالافانی پیغام	مائیکل ایلیٹ	115
12۔	ایک اسلامی مہم جوئی	مائیکل ایلیٹ	119

جہاں گرد

رضا اصلان

سن 1325 کی گرمیوں کے ایک دن 21 سالہ قانون دان کہ نام جس کا ابن بطوطہ تھا، مراکش کی ایک بستی طنجہ (Tangier) میں واقع اپنے گھر سے مکہ مکرّمہ کی زیارت کو روانہ ہوا۔ بعد ازاں اپنی کتاب ''رحلہ'' (Rihla) میں اس مشہور زمانہ سفر کا احوال انتہائی مترنم انداز میں بیان کرتے ہوئے ایک سن رسیدہ ابن بطوطہ بتاتا ہے کہ ''میں نے تمام عزیز و اقارب بشمول خواتین و حضرات کو چھوڑ دینے کا عزم صمیم کر لیا تھا اور اپنے گھر کو یوں خیر باد کہا جیسے پرندے اپنے گھونسلوں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔''

یہ سفر تقریباً 30 برس کی مدت اور ایک لاکھ کلومیٹر سے زائد فاصلے پر محیط تھا۔ طنجہ میں اپنے گھر واپس پہنچنے تک ابن بطوطہ پیدل، گدھے، اونٹ اور کشتی کی سواری کے ذریعے علم اور تجربات کی جستجو میں تقریباً ساری کی ساری اسلامی دنیا اور اس سے بھی آگے کا سفر طے کر چکا تھا۔ اور اگرچہ علم کی یہ جستجو اسے آخر کار چین جیسے دور افتادہ ملک تک بھی لے گئی (کیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بھی ہمیں یہ تلقین نہیں کی تھی کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے) تاہم ابن بطوطہ زیادہ تر اس خطے کی حدود میں ہی رہا جو اس زمانے میں دارالسّلام ''اسلام کا گڑھ'' کے نام سے مشہور تھا یعنی دنیا کا وہ خطہ جہاں مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی قانون کا غلبہ تھا۔

ایک خالص جغرافیائی مفہوم میں دارالسّلام وہ زمینی خطہ تھا جو مسلمانوں کے زیرنگیں تھا

جس کے اندر مکّہ جو بقول ابن بطوطہ ''اسلامی دنیا کا قانونی/انتظامی مرکز تھا'' ایک دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ تاہم اس کے اور اس کے ہم عصر دانش وروں کے خیال میں دارالسّلام محض جغرافیائی اکائی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسے مثالی تصور، ایک ایسی منزل مراد، اور ایک ایسی آگاہی کا نام تھا جو کہ دنیا کے ان تمام ہم خیال افراد کی میراث تھی جو تقریباً یکساں نظریہ و عمل رکھنے کے علاوہ ایک طرح سے واحد اور متحدہ الوہی کنبے کے ارکان تھے: یعنی اُمّہ کی طرح تھے۔ یہی وہ چیز تھی جو کہ اس سیاح، تاجر، مجاہد اور کسان کے لئے شناخت کا منبع بن گئی ہوگی۔ بلاشبہ، جیسا کہ امریکی مورخ راس ڈن نے وضاحت کی ہے، ابن بطوطہ کا شمار ''ایک ادبی، متحرک اور عالمی تصور کے حامل طبقے'' میں ہوتا تھا اور وہ خود کو ''مراکش کا نہیں بلکہ اس دارالسّلام کا شہری سمجھتا ہوگا جس کی عالمگیر روحانی، اخلاقی اور سماجی اقدار اس کے لئے کسی بھی اور عقیدے سے بڑھ کر قابل احترام تھیں۔''

اگرچہ دارالسّلام کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور وہاں کی روایات، اقدار اور رسوم ورواج بھی اسلام کے بنیادی عقائد سے مطابقت رکھتی تھیں، مگر یہ خطے کے طول وعرض میں آباد اُمّہ میں پائی جانے والی وسیع النظری اور رنگارنگی ہی تھی جو کہ ابن بطوطہ کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے مسلم دنیا کے اس سفر کے دوران ایسی اشیاء کا مشاہدہ بھی کیا جو اس کے لئے اتنی ہی عجیب تھیں جیسا کہ وہ کسی بھی اجنبی کے لئے ہوسکتی تھیں۔ ترکی میں اسے یہ دیکھ کر شدید تعجب ہوا کہ بعض مسلمان خواتین کس طرح اپنے خاوندوں پر غالب تھیں۔ مالدیپ میں اسے مقامی باشندوں کے ملبوسات اور رسوم ورواج اخلاق سے گرے ہوئے محسوس ہوئے۔ پورے وسطی ایشیا میں اسے یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا کہ منگولوں کی روایات اس کے کٹر عقائد سے کس طرح متصادم تھیں۔ دوسرے الفاظ میں اگرچہ دارالسّلام کے باشندے ابن بطوطہ کی طرح ایک خدا اور ختم نبوّت پر یقین رکھتے تھے مگر ان کی ثقافت، رواج، عادات اور دنیاوی تصور ابن بطوطہ سے بالکل مختلف تھا۔

ابن بطوطہ کے دور میں اسلامی دنیا جن حقائق سے دوچار تھی وہ آج کے دور میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ تنوع اور وسیع النظری جو کہ ہمیشہ سے ہی اُمّہ کا طرّہ امتیاز رہی ہے، کئی صدیوں کے بعد اب ایک ارب ساٹھ کروڑ مسلمانوں میں پائے جانے والے متنوع عقائد، روایات، رسوم ورواج کے ایک حقیقی ذخیرے کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ اس کے

ساتھ ہی قومی سرحدوں کے پار وسیع پیمانے پر ہجرت اور لوگوں کی بتدریج آمد و رفت کی بدولت اُمّہ پھیل کر اس خطّے سے کہیں بھی آگے نکل چکی ہے، جسے دارالسّلام کہا جا سکتا تھا۔

آج کے دور میں ایسی صورتحال کو عالمگیریت کہا جاتا ہے: جس کی تعریف ڈنمارک کے فلسفیوں ہانس ہنرک اور جارج سارنسن نے یوں کی ہے کہ "یہ سرحدوں سے ماورا اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تعلقات کے ارتکاز کا نام ہے۔" تاہم کسی مغالطے کا شکار نہ ہوں: وہ دنیا جو آج سے سات سو برس قبل ابن بطوطہ کے مشاہدے میں آئی تھی اتنی ہی ہمہ گیر (یا ماورائے سرحد) تھی جتنی کہ آج کی دنیا ہے۔

اس کی ایک اہم وجہ وہ مربوط اسلامی دنیا تھی جو کہ منگولوں کے زیرنگیں تھی جنھوں نے ابن بطوطہ کے زمانے تک تقریباً سارا کا سارا وسطی ایشیا، روس اور چین فتح کر لیا تھا تاریخ کی وسیع ترین سلطنت قائم کر کے منگولوں نے جو کہ تاجروں کو نقل وحرکت کی مکمل آزادی دینے کے قائل تھے، اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں اشیاء اور افراد کی دور دور تک نقل وحمل کی حوصلہ افزائی کی۔ تجارتی راستوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی ثقافتی روابط میں بھی اضافہ دیکھنے میں آیا کیونکہ تاجر، عالم، صوفیا اور زائرین۔ خود ابن بطوطہ بھی اپنے طویل سفر کے دوران کسی نہ کسی مرحلے میں ان ساری شناختوں کا حامل رہا تھا۔ شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک سلطنت سے دوسری سلطنت اور ایک عملداری سے دوسری عملداری تک آزادی کے ساتھ آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ بلاشبہ اسلام کا سنہرا دور تھا، جو کہ مورخ مارشل ہاجسن کے مطابق "قرون وسطیٰ کے کسی بھی اور معاشرے کی نسبت سماجی، حتیٰ کہ ثقافتی معیاروں پر مبنی مشترکہ عالمی نظام کے قیام کے قریب تر تھا۔"

تبدیلی کا دور

دارالسّلام کے طول وعرض میں ابن بطوطہ کے شاندار تحقیقی یا مہماتی سفر کے صدیوں بعد اس دور کی سنہری چمک کچھ حد تک ماند پڑ چکی ہے۔ سائنس، تجارت، ریاضی، اور فنِ تعمیر کے شعبوں میں ازمنہء وسطیٰ کی اسلامی سلطنت کو جو غلبہ حاصل تھا اب اس کی جگہ دنیا کے اکثر اسلامی ممالک میں جمود اور زوال نے لے لی ہے۔ نوآبادیاتی نظام، مغربی استعماریت، بدعنوانی، خانہ

جنگیوں، انتہا پسندی اور دہشت گردی نے اس ثقافتی اور فنکارانہ غلبے کو شدید نقصان پہنچایا ہے جو ابن بطوطہ کے زمانے میں اسلام کی امتیازی خصوصیت تھا۔1924 میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور اس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی تقسیم نے مسلمان دانشوروں کے اس خواب کو چکنا چور کر کے رکھ دیا جو وہ کسی زمانے میں ایک متحدہ امت مسلمہ کے حوالے سے دیکھ رہے تھے۔گزشتہ ایک صدی کے دوران بہت سے مسلمان اب خود کو ایمان رکھنے والے عالمی اسلامی برادری کا رکن محسوس کرنے لگے ہیں نہ کہ کسی انفرادی ریاست کا شہری۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ مذہبی اور سیاسی ادارے جو کبھی مسلمانوں کی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں کیونکہ وسیع تر تعلیم اور نئے تصورات و معلومات کے مآخذ تک رسائی کی بدولت عام لوگوں میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کی خود اپنے طور پر تشریح کر سکیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے: دنیا میں جلد ہی سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کرنے والے مذہب کے مستقبل کے حوالے سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں زور پکڑ گئی ہیں۔ جیسا کہ اس طرح کے غل غپاڑے میں ہوتا ہے، اس وقت سب سے اونچی آواز انتہا پسندوں اور بنیاد پرستوں کی ہے۔ چنانچہ مغربی ذرائع ابلاغ میں اسلام کو تشدد اور دہشت گردی کے حامی مذہب کے طور پر اجاگر کیا جا رہا ہے۔

اس سب کے باوجود اکیسویں صدی میں دارالسّلام کے بچے کھچے تصور کے اندر سے کچھ نہ کچھ حیرت انگیز تبدیلی برآمد ہو رہی ہے۔شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے طول وعرض سے ایک نئی عالمی شناخت ظہور میں آ رہی ہے کیونکہ خطے کی آبادی کے کثیر حصے پر مشتمل نوجوان نسل جاگ اٹھی ہے اور اپنے سیاسی اور اقتصادی خوابوں کی تعبیر کے لئے آواز بلند کرنے لگی ہے۔اور اگرچہ یہ نام نہاد عرب سپر نگ بڑی تیزی سے پروان چڑھی ہے اور بعض معاشروں (تیونس، مصر) میں دوسرے معاشروں (لیبیا، شام) کی نسبت تبدیلی لانے میں زیادہ کامیاب رہی ہے، تاہم جس سرزمین پر ابن بطوطہ نے صدیوں پہلے سفر کیا تھا وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض قوم پرستی کی لہر نہیں ہے جیسا کہ مغرب میں بتایا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ نسل جو کہ نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی مثلاً سیٹلائیٹ ، ٹیلی ویژن، سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے قریبی روابط کی حامل ہے ایک نئی کثیر القومی شناخت تشکیل دے چکی ہے۔ایک ایسی شناخت جو کہ کسی نسلی، قومی یا فرقہ

ورانہ رنگ یا سرحد تک محدود نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ ایک ایسی شناخت ہے جس کی بنیاد اس نوجوان نسل نے رکھی ہے جو اپنے بدعنوان اور نااہل سیاسی، مذہبی اور اقتصادی اداروں سے نجات حاصل کرنے اور ابن بطوطہ کے دور کی ثقافت اور معاشرے کے سنہرے دور کی طرف لوٹنے کا مشترکہ عزم کئے ہوئے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے اندر بھی وسیع تر ثقافتی، نظریاتی اور حتی کہ مذہبی اختلافات بھی موجود ہیں۔ کسی کو اس سے کم کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ یہ تصور کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے عقیدے اور عمل میں کبھی نہ کبھی ہم آہنگی آ سکتی ہے بالکل ہی مضحکہ خیز ہے۔ صرف ایک بیوقوف یا خیالی دنیا میں رہنے والا نظریہ پرست ہی، جو کہ اکثر اوقات ہی ایک شخصیت کے حامل ہوتے ہیں، اس کے برعکس دعویٰ کر سکتا ہے۔

تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عالمی نوجوان نسل کی بدولت جو کہ ایشیا سے یورپ اور وہاں سے شمالی امریکہ تک پھیلی ہوئی ہے، دارالسّلام ایک بار پھر محض جغرافیائی منزل سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو چکا ہے۔ یہ ایک مرتبہ پھر ایک مثالی تصور، ایک جستجو اور ایک مشترکہ احساسِ بصیرت بن چکا ہے۔ اُمّہ جو کہ ہمیشہ سے ہی ایک عملی تصور رہا ہے، اب عملی شکل اختیار کرنے کے قریب ہے کیونکہ انٹرنیٹ پر ایسے اسلامی طبقات یا تنظیمیں تشکیل پا رہی ہیں جو زمان و مکان کی سرحدی پابندیوں سے آزاد ہیں۔

یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ یہ نئی نسل اسلام کو کہاں لے جائے گی۔ عرب سپرنگ کے مکمل مضمرات کا احاطہ کرنے میں ابھی کئی برس لگیں گے۔ تاہم جو بات یقینی نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر اسلامی خطے کے اندر ایک وقت میں ایک احتجاج کے نتیجے میں جو نئی دنیا وجود میں آ رہی ہے وہ ایسی دنیا ہے جو کہ سیلانی مسافر حاجی ابوعبداللہ محمد ابن بطوطہ (جس نام سے وہ 1354ء میں اپنی طنجہ واپسی پر معروف ہوا) کے لئے قطعاً اجنبی نہ ہوتی۔

☆☆☆☆☆

اعتدال پسند اسلام کا عروج

بوبی گھوش۔قاہرہ

قاہرہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر سلفی رہنما کمال حبیب کا انتظار کرتے ہوئے میرے اندر اچانک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے ابھی پتہ چلا ہے کہ میری مترجم شہیرہ امین، ایک مصری صحافی بغیر آستینوں کی قمیص زیب تن کئے ہوئے ہے اور اس کا سر بھی ننگا ہے۔ میرے تجربے کے مطابق سلفی فرقے کے لوگ جو کہ اسلام کے بہت سخت اصول رکھنے والے مکتبہ فکر کے پیروکار ہیں نسوانیت کے ایسے مظاہرے کا بہت ہی تنگ نظری سے جائزہ لیتے ہیں۔ مجھے بغداد کا وہ وقت یاد ہے جب ایک سلفی مبلغ نے انٹرویو کے لئے ایک خاتون فوٹوگرافر بلانے پر مجھے لعنت ملامت کی اور اُردن کے شہر سالت کا وہ وقت بھی یاد جب ایک اور سلفی نے اپنی کرسی سے اچھل کر اپنی نوجوان بیٹی کے بازو پر اس وقت تھپڑ مارا جب وہ حادثاتی طور پر کمرے میں اپنا چہرا چھپائے بغیر میری کافر نگاہوں کی زد میں آ گئی تھی۔

مجھے یہ اطلاعات ملی ہیں کہ اب وہ ستر کی دہائی جیسا شدت پسند نہیں رہا جب اس نے کسی کے ساتھ مل کر انقلابی مصری اسلامک جہاد کی بنیاد رکھی تھی۔ یا پھر 1980 کی دہائی والا جبکہ وہ صدر انوار سادات کے قتل کی سازش کے حوالے سے جیل میں قید کر دیا گیا تھا۔ جیل جانے کے ایک عشرے بعد اس نے سیاست ترک کر دی تھی مگر عرب سپرنگ کی لہر آنے کے بعد وہ نئے سرے سے ایک زیادہ معتدل پارٹی کے رہنما کے طور پر پھر میدان میں آ گیا ہے۔ اس نے اجلاسوں میں

ہونے والی پریس کانفرنسوں میں مفروضہ طور پر ایسی خواتین کی موجودگی کو بھی قبول کرلیا ہے جو ننگے سر بیٹھی ہوتی ہیں۔ مگر مجھے خدشہ ہے کہ وہ بغیر آستین والی قمیضوں کے حوالے سے ہی موقف اختیار کرسکتا ہے۔

مجھے حبیب کی آمد پر پریشانی کی ضرورت نہیں ہوئی۔ وہ کمرے کے اس طرف سے ایک خوشگوار سلام کرتا ہے اور پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک چمکدار نیلا کوٹ زیب تن کئے ہوئے ہے اور وہ ہاتھ میں ایک سمارٹ فون تھامے ہوئے ہے۔ وہ سیدھا میری مترجم کی آنکھوں میں جھانکتا ہے اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ دونوں وحشتناک قسم کی نمی کی شکایت کرتے ہیں۔ کیا شہیرہ پیپسی پسند کرے گی؟ وہ اصرار کرنے کے انداز میں پوچھتا ہے۔

میرے قاہرہ پہنچنے سے چند ہفتے قبل ہی سلفی فرقے والوں نے امبابا کے علاقے میں قبطی عیسائی گرجا گھروں کو جلا دیا تھا جو ہمارے اجلاس کی جگہ سے غالباً15 منٹ کی دوری پر واقع ہیں۔ سلفی مردوں نے ان عورتوں کو بھی ہراساں کیا تھا جو کسی مناسب پردے یا حجاب کے بغیر ان کے علاقے میں بھٹک گئی تھیں۔ آمر حسنی مبارک کی پولیس اور خفیہ سروس کے کارندوں کے طویل کے صبر آزما دور کے بعد سلفی اپنی نئی نئی آزادی کو تشدد کے نئے جذبے کے ساتھ مناتے نظر آتے تھے۔

تاہم مابعد مبارک دور میں چند ہفتے بھی ایک مکمل زمانہ لگتا ہے۔ بہت سے سلفی، رہنماؤں نے سیاسی میدان میں اترنے کا فیصلہ کرلیا اور وہ چند شر پسند عناصر کی وجہ سے اپنا تاثر خراب کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ چنانچہ حبیب نے قبطی رہنماؤں کے ساتھ بڑے پیمانے کا ایک مصالحتی اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا، اور وہ مجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ گرجا گھر جلانے والے شدت پسندوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ''خلاس، ختم'' وہ اپنے ہاتھوں کو حتمی قسم کے، اشارے کی صورت میں پھیلاتے ہوئے کہتا ہے،''ماضی گزر چکا ہے اور اس طرح کے خوفناک کام کرنے والے افراد ماضی کا حصہ ہیں۔ وقت ختم ہو چکا ہے۔''

میں حیران تھا کہ آیا حبیب کا پیغام مغربی صحافیوں کی فرمائش یا پسند کے مطابق تیار کیا گیا تھا یا یہ کسی نئے امکان کی جھلک پیش کر رہا تھا۔ اگلے روز مصر اور تیونس کی نوخیز جمہوریت میں مجھے ہر رنگ کے اسلام پسند جن میں انتہا پسند سلفیوں سے لے کر اخوان المسلمین جیسے زیادہ

قدامت پرست گروہ تک بھی شامل تھے، دکھائی دیئے اور جن کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو دفن کر چکے ہیں اور اب اعتدال پسند دھارے میں نئے انداز کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ ''اب ہم اس طرح کی پارٹی بن کر نہیں رہ سکتے جس کا نعرہ 'یہ مردہ باد' یا 'وہ مردہ باد' ہوتا ہے''۔ یہ الفاظ اخوان المسلمین کے ایک بڑے پائے کے رہنما الصیام الریان کے ہیں۔ ''ہم جس چیز کا پرچار کر رہے تھے وہ اب ختم ہو چکی ہے، لہذا ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔''

جیسے جیسے عرب تبدیلی کی بہار تپتی ہوئی گرمی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، ویسے ہی تحریکوں نے تیزی سے سیاسی جماعتوں کی تشکیل کرتے ہوئے قومی سطح پر خزاں اور سرما سے پہلے ہونے والے انتخابات میں اپنا تاثر قائم کرنے کے مقصد کے حصول کے لئے مہمیں شروع کر دی ہیں۔ اسلامی شناخت کو لاحق خطرات کے حوالے سے خوف و ہراس پر مبنی لفاظی کی جگہ ایسے سیاسی پیغامات نے لے لی ہے جو کہ مغربی جمہوریت میں کسی بھی سیاسی جماعت کے محاذ سے جاری کئے جا سکتے تھے: یہ سب ملازمتوں، سرمایہ کاری کے مواقع، عوامی شمولیت وغیرہ کے نعرے ہیں۔

یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ سیاسی بیانات سے باہر یہ کھیل کس طرح کھیلا جا رہا ہے۔ بہت سے مصری باشندے، خاص طور پر نوجوان اپنی آئندہ حکومت کے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہے، وہ ابھی تک اپنی توجہ دستیاب حکومت پر مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ مختلف جماعتوں کے کارکن التحریر اسکوائر پر مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں تا کہ فوجی قیادت کی حامل عبوری حکومت پر مبارک دور کے جرائم کے حوالے سے مقدمات کے لئے دباؤ ڈالا جا سکے۔ ''وہ مستقل طور پر انقلابی انداز اپنائے ہوئے ہیں'' یہ الفاظ آزاد خیال سیاست دان ہشام قاسم کے ہیں۔ وہ سیاست کے لئے ابھی تک منظم نہیں ہیں۔

تنظیم، اس کے برعکس، اخوان المسلمون کا ہمیشہ سے ہی ایک مضبوط ہتھیار رہی ہے۔ 1928 میں اسلامی قانون واقدار کی ترویج کے لئے قیام میں لائی جانے والی اس تنظیم کو پے در پے برسر اقتدار آنے والے رہنماؤں کے ہاتھوں بہت مظالم سہنے پڑے ہیں۔ اس کے ارکان کی تعداد کا تخمینہ ایک لاکھ سے لے اس سے کئی گنا زیادہ تک کا ہے۔ مبارک دور میں اخوان المسلمون کے ساتھ کھلی وابستگی پولیس کے مظالم یا اس سے بھی بدتر صورت حال کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔ مغرب میں اس تنظیم کو بنیاد پرست اسلامی تصورات برآمد کرنے کے منبع کے طور پر طویل عرصہ تک

خدشات کی نظر سے دیکھا جاتا رہا: حماس کی طرح کی تشدد پسند تنظیمیں اخوان المسلمون کے ہی دھڑے کی طرح ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک القاعدہ کے طرح کی دہشت گرد تنظیموں کا سرا اسلام پسندوں سے ہی جا ملتا ہے۔ تاہم مصر میں اس تنظیم نے بہت پہلے ہی دہشت پسندانہ جہاد کے نعروں کو مسترد کر دیا تھا، اور یوں لگتا ہے کہ اس کا ایک سماجی تحریک کے طور پر بھی اتنا ہی مقام ہے جتنا کہ ایک سیاسی اکائی کے طور پر۔ مصر کے غریب عوام طویل عرصہ سے اخوان المسلمین کا ربط سماجی خدمات، مثلاً بلا معاوضہ طبّی اور تعلیمی سہولتوں سے جوڑتے چلے آ رہے ہیں۔

اب اخوان المسلمون کو اپنا دائرۂ عمل وسیع کرتے ہوئے درمیانے اور متمول طبقے کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لینا چاہیئے۔

بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو کہ جمعرات کی شام کو 6 اکتوبر برج کے مقام پر دریائے نیل کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور ہلکی پھلکی دل لگی کی امید کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہوئے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں ایک اسلامی قیادت کی حامل حکومت کے تصور سے پریشان نہیں لگتے۔ ایک یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم 20 سالہ فاضل کے الفاظ میں ''اگر وہ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں تو ان کی کارکردگی کا معیار عملی نتائج کو بنائیں گے نہ کہ ان کی داڑھیوں کی لمبائی کو''۔

ان حالات میں آپ اسلام پسندوں کو اس بڑھتی ہوئی مقبولیت پر خوشیاں مناتے دیکھنے کی توقع جو کہ ان کے خیال میں ان کے انتہا پسند نظریات کی تصدیق کرتی ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر رہے۔ اس کے برعکس وہ ایک سیاسی مرکز کی طرف بڑھ رہے ہیں ایسے موقف اپناتے ہوئے جو مغربی جمہوریتوں میں قطعاً اجنبی نہ ہوں۔ مصر میں اخوان المسلمون اور تیونس میں النہضہ (نشاۃ الثانیہ) کے رہنما اقتصادی ترجیحات کی باتیں کر رہے ہیں: ملازمتوں کے مواقع پیدا کرنا، قرضوں میں کمی، بیرونی سرمایہ کاری کی ترغیب، ہنرمندوں کے اخراج کی روک تھام وغیرہ وغیرہ۔ شریعت کے نفاذ یا خواتین اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق میں کمی کی بات بہت کم ہی کی جاتی ہے۔

ناقدین کے ان خدشات کو دور کرنے کے لئے کہ اسلام پسند مصر کو دوبارہ ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کر دیں گے، اخوان المسلمون اپنا ایک ہاتھ رضامندانہ طور پر اپنی پشت پر باندھ کے میدان میں آ رہی ہے: اس کا نیا سیاسی بازو ''فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی مابعد مبارک دور

کے پہلے عام انتخابات میں، جو کہ خزاں کے اواخر میں ہونے کی توقع ہے، صرف نصف نشستوں پر مقابلہ کرے گی اور 2012 کے اوائل میں ہونے والے صدارتی مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔(جب اخوان المسلمون کے ایک اہم رہنما عبدالمیعم ابوالفتح نے مئی میں صدارتی مقابلے میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو اسے پارٹی سے نکال دیا گیا) اس طرح یہ ضمانت حاصل ہوگئی ہے کہ پارٹی نئی پارلیمان میں جس پر کہ نیا آئین تحریر کرنے کی انتہائی حساس ذمہ داری آپڑے گی، اکثریت نہ لے سکے گی۔ اریان کے بقول، نئے قوانین کی تشکیل میں تمام جماعتوں کی رائے لی جائے گی۔ اس سوال کے جواب میں کہ اخوان المسلیمون سیاسی برتری کا مظاہرہ کرنے میں زیادہ سرگرمی کیوں نہیں دکھارہی اریان نے کہا کیونکہ ''ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے خوف پیدا ہوگا اور خوف کی عدم موجودگی ہماری لئے اتنی ہے، بہتر ہے جتنی کہ یہ مصر کے لئے اچھی ہے''۔

میری جن آزاد خیال نظریات رکھنے والوں سے ملاقات ہوئی ہے وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے ۔بعض کے خیال میں یہ ایک کھوکھلا دعویٰ ہے: اخوان المسلیمون کو یقین ہے کہ وہ اکثریت حاصل نہیں کر سکتے۔ قاہرہ کے انتہائی مشہور ناول نگار اور ممتاز آزاد خیال دانشور الاعلیٰ الاسوانی کے مطابق اخوان المسلمین کو اکثریت حاصل نہیں ہے، جس کا ایک ثبوت اس کے مطابق بہت سی یونیورسٹیوں میں ہونے والے طلباء تنظیموں کے انتخابات میں آزاد خیال امیدواروں کی جیت ہے۔ تاہم وہ پھر بھی خدشات کا شکار ہے۔ الاسوانی کے مطابق اپنے تمام تر بلند بالا سیاسی اصولوں کی نمائش کے باوجود ''اقتدار کے حصول کے لے اخوان المسلمون کے نزدیک کوئی بھی حربہ ناجائز نہیں ہے۔ لہذا ہم ان پر کبھی بھی اعتماد نہیں کرسکتے۔'' دوسرے لوگوں کو بھی یہ سب کچھ ایک خوبصورت چال کی طرح لگتا ہے: اخوان المسلمون باقی ماندہ نشستوں پر اپنے نمائندے آزاد امیدواروں کی صورت میں کھڑا کر کے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تا کہ اس طرح سے پارلیمنٹ میں آزاد خیال طبقے کو نکال باہر پھینکے۔

آزاد خیال جماعتوں میں انتشار سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جن بچوں نے مصر اور تیونس میں آمروں کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا وہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ گوگل کا نوجوان عہدے دار جو کہ التحریر اسکوائر کے انقلاب کا سب سے زیادہ شناسا چہرہ تھا نظروں سے غائب ہو چکا ہے۔

پرانے آزاد خیال سیاست دان جن کے اندر نوجوانوں جیسی انقلابی خصوصیات اور اسلام پسندوں جیسی تنظیمی صلاحیتوں کا فقدان ہے اپنی بقاء کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ایٹمی سرگرمیوں کے حوالے سے اقوام متحدہ کا سابقہ نگران اور نوبیل انعام یافتہ شخصیت محمد البرادی ابھی تک گھر مگو میں ہے۔

آزادخیال نظریات کے حامی بھی کمزور جمہوریت پسندی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ بہت سی ممتاز آزاد خیال شخصیات بشمول البرادی نے پارلیمانی انتخابات کے بالجبر التواء اور غیر منتخب کردہ ماہرین کے ذریعے آئین کی از سرِ نو تشکیل کے لئے دستخطوں کے حصول کی مہم شروع کردی ہے۔ قاہرہ میں تعینات ایک مغربی سفارت کار نے بتایا کہ 'پہلے آئین کی اصلاح کی قسم' سے ''ظاہر ہوتا ہے کہ، آزاد خیال امیدوار انتخابات میں اپنی کارکردگی کے حوالے سے بے یقینی کا شکار ہیں اور کچھ تحفظات کا حصول چاہتے ہیں''۔ سیاسی حوالے سے بھی آزاد خیال رہنماؤں کی طرف سے التواء کا مطالبہ ایک کھلی مفاد پرستی ہے: اس طرح انہیں اخوان المسلمون کی عوامی سطح پر تنظیم کی صلاحیت کو آزمانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا وقت مل جائے گا۔

کیا آزاد خیال اور اسلام پسند ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ بنیادوں پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت کا مظاہر کر سکتے ہیں؟ یہ سوال نہ صرف قاہرہ اور تیونس میں اٹھایا جارہا ہے بلکہ دمشق اور صنع میں بھی پوچھا جارہا ہے: اگر مذہبی اور لادینی تنظیمیں مصر اور تیونس میں مل جل کر کام کر سکتی ہیں تو شام، یمن اور دوسرے عرب ممالک کے لئے جہاں انقلابی ہوائیں چل پڑی ہیں، یہ ایک طاقتور پیغام ہوگا۔ مغربی حکومتوں کا مفاد بھی اس کے جواب میں مضمر ہے۔ مبارک حکومت کے خاتمے کے وقت سے امریکہ اور یورپ میں زیادہ تر مباحثہ اس موضوع پر ہو رہا ہے کہ آیا اس حکومت کے جانشین مغرب کے ساتھ سمجھوتے اور اسرائیل کے ساتھ امن قائم کرنے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ تاہم نئی عرب جمہوریت کے پہلی اور انتہائی اہم آزمائش یہ ہوسکتی ہے کہ آیا یہاں موجود متصادم سیاسی رجحانات باہم جذب ہوجانے یا ساتھ ساتھ موجود رہنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

اسلام پسندوں نے ابھی تک سودے بازی یا سمجھوتہ نہ کرنے کی عظیم تر صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے اور اوبامہ حکومت کا خیال یہ لگتا ہے کہ ان سے اس معقول رویے کی توقع رکھی جاسکتی ہے جو کہ جوشیلے پن اور بنیاد پرستانہ رجحانات کے برعکس ہوتا ہے۔ جون کے آواخر میں امریکی

وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ امریکی انتظامیہ اسلام پسندوں کے ساتھ ربط رکھنے والے مصری پارلیمانی رہنماؤں کی وساطت سے بالواسطہ روابط سے لے کر براہ راست روابط تک اخوان المسلمون کے ساتھ بات چیت یا میل ملاپ کی صلاحیت کو بہت بنانے پر توجہ مرکوز کرے گی۔ تاہم اسلام پسندوں کی طرف سے صلح جو یانہ انداز و اطوار کا مظاہرہ مغربی ممالک کے عوام کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا جا رہا۔ وہ یہ سب کچھ اپنے ہی ہم وطنوں یعنی مصر اور تیونس کے باشندوں کے یقین دہانی کے لئے کر رہے ہیں۔ (یہ امر قابل ذکر ہے کہ میری گفتگو میں امریکہ اور اسرائیل کا ذکر کتنا کم ہوتا ہے۔) اسلام پسندوں کو محسوس ہو گیا ہو گا کہ ان کا انقلابی لب و لہجہ اب کام نہیں آ سکتا۔ انہوں نے ایران اور غزہ میں انتہا پسندانہ طرف عمل کے منفی نتائج کا مشاہدہ کر لیا ہے: یعنی مغربی امداد اور غیر ملکی سرمایہ کاری رک جانے کے ساتھ ہی اقتصادی پابندیاں بھی نافذ کی جا سکتی ہیں۔ جس قدر وہ اقتدار کے خواہش مند ہیں، اس کے پیش نظر وہ دیوالیہ ریاستوں کے انتظام کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔

یہ نکتہ بھی زیر غور لایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے وقت حاصل کر رہے ہیں، اگر چہ اس کے علاوہ دیگر معقول وضاحتیں بھی موجود ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ عرب انقلاب نے اسلام پسند تنظیموں میں موجود اعتدال پسند اکثریت کو آزادانہ موقف اپنانے کے مواقع فراہم کر دیئے ہیں۔ کئی عشروں کے جبری نظام کے دوران صرف انتہا پسندوں کو ہی جرأت اظہار کا حق حاصل تھا، جس کا مفہوم باقی دنیا میں یہ لیا گیا کہ وہ ساری کی ساری تحریک کی نمائندگی یا ترجمانی کر رہے ہیں۔ اب اس جبر کے خاتمے کے بعد اخوان المسلمون کے اندر اعتدال پسند عناصر سامنے آ رہے ہیں۔ ان کی تعداد شدت پسندوں سے بہت زیادہ ہے، اور ایک ابھرتے ہوئے جمہوری نظام کے اندر یہ صورتحال انہیں با اختیار بناتی ہے۔ وہ لائحہ عمل طے کرنے میں پیش پیش ہیں۔

اس کے علاوہ ایک مخلوط حکومت میں شاید غالب فریق کے طور پر حکومت چلانے کے روشن امکانات بھی موجود ہیں۔ ایل اریان مستقبل میں پیش آنے والی ممکنہ آزمائشوں پر غور کرتے ہوئے مثبت طور پر پریشان نظر آتا ہے۔ ''ملازمتیں؟ یہ کہاں سے آئیں گی؟'' وہ گویا ہوتا ہے۔ ''تمہیں ملازمتیں پیدا کرنی ہوں گی۔ ہمیں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے نہ کہ صرف قرضوں

کی۔ ہمیں کاروبار لانے والوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں برآمدات بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم زیادہ سے زیادہ محنت کریں تو پانچ برسوں میں مصر بہت بڑی منڈی بن جائے گا۔'' دوسرے لفظوں میں یہ وقت قرآنی علوم کی تشریح کے حوالے سے بحث مباحثہ کرنے کا نہیں ہے۔

اسلام پسندوں کی طرف سے یکسر نیا موقف اور انداز اپنانے کے حوالے سے ایک اور عنصر بھی بہت اہم ہے: التحریر اسکوائر کی انتہائی موثر سیاسی کشش۔ اسلام پسندوں کو اس امر کا اعتراف ہے کہ جس انقلاب نے انہیں آزادی فراہم کی اس کی قیادت آئی پیڈ (Ipad) رکھنے والی اس نسل نے کی جس کے مطالبات عالمگیر نوعیت کے تھے نہ کہ مذہبی نوعیت کے: یعنی ملازمتیں، انصاف، وقار وغیرہ وغیرہ۔

ال اریان کے مطابق ''نوجوانوں نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اور ہمارا لائحہ عمل ان کے تصورات سے قریب تر ہونا چاہیئے۔''

اگرچہ اسلام پسند تیزی سے سیاسی مرکز کی طرف گامزن ہیں مگر ابھی بھی ایک خارجی غیر متشکل یا مروجہ عقائد سے منحرف سلفی اسلام کی گنجائش موجود ہے۔ میں نے تیونس کے ایک کیفے میں عبدالمجید حبیبی سے ملاقات کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ حزب التحریر کا رہنما ہے، جو کہ ایک ایسی انتہا پسند تنظیم ہے، جس کو ابھی تک سیاسی جماعت کے طور پر کام کرنے کا اجازت نامہ نہیں دیا گیا۔ حسن اتفاق سے تیونس سے تعلق رکھنے والی میری مترجم سلمیٰ محفوظ بھی ایک عورت ہے: وہ جینز پہنے ہوئے ہے اور اس کا بھی سر ننگا ہے۔ حبیبی اس کی موجودگی میں بے چینی سی محسوس کر رہا ہے اور جب وہ اس سے بات کرتی ہے تو اس وقت بھی اپنی نگاہیں میرے اوپر ہی مرکوز رکھتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی خاص سروکار نہیں ہے کہ وہ ایک سیاسی جماعت تشکیل دے سکتا ہے یا نہیں کیونکہ وہ یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ انتخابات اور آئین اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ ''قرآن مجید کے ہوتے ہوئے جس میں کہ معاشرے کی رہنمائی کے لئے ہر طرح کے قوانین موجود ہیں، ہمیں آئین کی کیا ضرورت ہے؟''۔ وہ جدید سرحدوں یا قوموں پر بھی یقین نہیں رکھتا: ساری کی ساری اسلامی دنیا ایک ہی روشن خیال حکمران کے تابع ہونی چاہیئے۔

دنیا کے حوالے سے اس سلفی نظریئے سے میرا واسطہ گزشتہ پندرہ برس سے چلا آ رہا ہے۔

مگر ٹھہر یئے۔ جیسے ہی ہماری گفتگو مزید آگے بڑھتی ہے، جیبی کے موقف میں نرمی آجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''ہمارے خیال میں لوگوں کو خوشی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب وہ قرآن پر عمل کریں''۔ ''مگر ایسا نہ کرنا چاہیں تو ہمیں ان پر یہ مسلط نہیں کرنا چاہیئے''۔ جب وہ خدا حافظ کہنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ مجھ سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر سلمی سے بھی۔

☆☆☆☆☆

اس کے لئے ایک پوری بستی قربان کرنی پڑتی ہے

کارل وِک۔استنبول

کچھ برس قبل چندروز ایک نئی اپارٹمنٹ بلڈنگز میں کچھ بھیڑیں بچ گئی تھیں، لہذا کہیں پر کچھ نہ کچھ گھاس بھی ضرور پائی جاتی ہوگی۔ ایک ایسا شہر جو کہ اپنے وسیع ودلکش مناظر یعنی پانی، پل، آسمان وغیر کی بنا پر شہرت رکھتا ہو' اس میں بسنے والے ایک کروڑ 30 لاکھ باشندوں کی اکثیریت کنکریٹ کی بھرمار کے ہاتھوں بیزار نظر آتی ہے۔ آج ایک تین کمروں کے اپارٹمنٹ سے آغاز کرتے ہوئے جس میں مویشیوں کی بجائے گیارہ عدد رشتہ دار ساتھ رہ رہے ہوں، ایک آدمی کو جو کہ چھ ماہ پہلے اناطولیہ کے پہاڑی علاقے میں نیم دراز حالت میں استنبول کے تصور میں مگن مگر نگاہ اپنے ریور پر رکھے ہوئے تھا، گھاس کے کسی قطعے تک پہنچنے سے قبل بکسیلر جیسے علاقے سے گزرتے ہوئے، اندرون شہر سے ہوئی اڈے کے درمیان نصف راستے تک، ایک زندگی سے دوسری زندگی بھر بلاکس چلنے پڑے ہوں گے۔ 0-3 ہائی وے سے روزانہ گزرنے والے افراد سڑک کے کنارے، کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، نظریں آٹھ لائنوں والی ٹریفک کے اوپر جمائے ہوئے خود کو ماحول کا عادی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرح کے لوگوں کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

''وہ مشرق کو اپنے ساتھ لے آتے ہیں'' ترکی کے اناطولیہ جیسے اہم ساحلی علاقے سے ہجرت کر کے استنبول آنے والے افراد میں سے ایک یلدرم سفقسی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا، 13 برس قبل مشرقی اناطولیہ کے شہر مَس سے بذریعہ بس یہاں پہنچنے والا سفقسی جوتے بناتا تھا۔

آج وہ ایک فرنیچر سٹور چلا رہا ہے جس میں جدید ترکی کے تسلیم شدہ معیار کے حامل سامان کی بھرمار ہے: صوفے اور کرسیاں جو کہ دن کے اختتام پر اس پلنگ کے ساتھ ڈال دیئے جاتے ہیں جو کہ وطن سے آنے والے مہمانوں کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اقتصادی ہجرت کی بناء پر تبدیلی کے عمل سے گزرنے والی قوم کے افراد کے گھروں میں رہائشی کمروں کے اندر ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیرت انگیز چیز موجود ہوتی ہے۔

''کورم سے تعلق رکھنے والے لوگ جرابیں بناتے ہیں''، سفتسی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ بکسیلر کے بارے میں لوگوں کو پہلے سے کیا کیا معلوم ہے، ایک ایسا علاقہ جہاں تقریباً ساڑھے سات لاکھ لوگ دولت کے تعاقب میں سرگرداں ہیں: جغرافیہ منزل ہے۔ ماردِن سے تعلق رکھنے والے لوگ مٹھائیاں اور بیکری کی دیگر اشیاء تیار کرنے کا کام کرتے ہیں۔ تونیا کے لوگ کھانے پینے کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ سفتسی جس کے نام کا مطلب ہے ''کسان'' اس بات پر ہلکی سی شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک ایسے شہر میں ملازمت کی تلاش میں پورے دو ہفتے لگ گئے جہاں آگے نکلنے کا جنون اس قدر طاری نظر آتا ہے کہ گورکن اپنی خدمات کا تشہیر کے لئے قبر کے کتبے پر اپنا سیل فون نمبر بھی کندہ کر دیتے ہیں: تیار کردہ سیمال استا 1276 266 0532۔ سیمال کا کہنا ہے کہ وہ اپنا ٹیلی فون نمبر تبدیل نہیں کر رہا۔ سیمال جو کہ 15 برس کی عمر میں مشرقی اناطولیہ کے شہر ارض روم سے آیا تھا تو اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں ہی قیام پذیر ہوا تھا۔ یہ 51 برس قبل کی بات تھی۔ ''اس وقت قبرستان بہت زیادہ خالی ہوتا تھا''۔

یہی حال استنبول کا تھا، ایک ایسا شہر جو اس وقت تک قسطنطنیہ تھا۔ اور عیسائی بھی۔ جس وقت تک مسلمان سیاح ابن بطوطہ یہاں سے گزر نہیں گیا اور اسے دنیا کا سب سے بڑا شہر قرار نہیں دے دیا۔ وہ اب ایسا نہیں رہا مگر ایک کروڑ 30 لاکھ کی آبادی کچھ کم نہیں ہوتی اور خوش آمدید کہنے والی چٹائی ابھی تک باہر موجود ہے۔ ''خدا کرے ہماری کامیابی جاری رہے اور استنبول پھلتا پھولتا رہے''، یہ الفاظ کئی عمارتوں کو ڈھانپتے ہوئے بڑے بڑے بل بورڈز کے شیٹوں پر لکھے نظر آتے ہیں جو کہ وزیر اعظم طیب اردوان جس کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (جس کا ترکی زبان میں مخفف AKP بنتا ہے) استنبول کی موجودہ حالت سے مکمل ہم آہنگ ہے: ایک ایسی جگہ جو ایک طرح کے لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے اور جس پر دوسری طرح کے لوگوں کا غلبہ ہو چکا

ہے۔ اردوان کی پیدائش استنبول کی ہے مگر اس کا تعلق بکسیلر کے باشندوں کی طرح اناطولیہ کے سیاہ فام ترکوں سے ہے۔ زمین سے رشتہ استوار کئے ہوئے اور پارسا مسلمان کے طور پر یہ لوگ متمول طبقے کے ان سفید فام ترکوں کے بالکل برعکس ہیں جن کی قومی معاملات پر طویل اور سخت گرفت عوام کی اکثریت پر بداعتمادی کی کسی طرح بھی کم غمازی نہیں کرتی۔ اب سانولے ترکوں نے شہر کو اس طرح تبدیل کر کے رکھ دیا ہے جس طرح انہوں نے ملکی سیاست کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اردوان اور اس کی اے کے پی تین بار برسراقتدار آچکے ہیں' اور اب آخری مرتبہ جون میں ان سانولے ترکوں کے جذبات کی مقبول عام لہر پر بیٹھ کر جو اسلام اور قوم پرستی دونوں کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں (اور جو ترکہ میں جدیدیت کے مترادف ہے)۔

پیمانوں کی قدر کا تعین کرنا

یہ پاسنگ یا دونوں پلڑوں کے برابر ہونے کی ایسی صورتحال ہے جو ترکی میں اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آئی، یعنی خدا اور ملک کے درمیان توازن۔ فوج نے چار عشروں میں ریاست کو ممکنہ خطرات بشمول اسلام سے بچانے کے لئے چار مرتبہ بغاوت کی ہے۔ تاہم بغاوت یا تختہ الٹنے کی کاروائی ایک میکانکی عمل ہے جو افراد کے پاس نہیں ہوتا اور انہیں اپنے اندر برپا اطاعت و فرمانبرداری کی جنگیں پیدائش کے وقت سے ہی خود لڑنی ہوتی ہیں۔ ترکی میں نومولود بچے کے کان میں جو اولین الفاظ سرگوشی کی صورت میں ڈالے جاتے ہیں وہ قرآن کی آیات ہی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود پہلی جماعت سے ہی کیوں بچے کو جدید لباس میں ملبوس آدمی کی پرستش سکھائی جاتی ہے۔

''مسلمان والدین کی حیثیت سے ہم اپنے بچوں کو ہر ممکن حد تک اسلام کے دائرے میں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں''۔ یہ الفاظ بکسیلر میں جائیداد کی خرید و فروخت کا کاروبار کرنے والے سرتاس گیونز کے ہیں جو فرنیچر کی دوکان کے قریب ہی اپنے دفتر میں براجمان ہے۔''اور ترک قوم کے باشندوں کے طور پر ہم اپے بچوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ ملک کس طرح ایک کمانڈر کی کوششوں سے معرض وجود میں آیا''۔ مصطفےٰ کمال اتاترک نے، جو شام کے لباس میں ملبوس اور ہر کرنسی نوٹ اور شہر کے چوک پر مسکراتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اس سلطنت عثمانیہ کو ختم کر دیا تھا

جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو رسماً متحد رکھے ہوئے تھی۔ اس کے برعکس اس نے اس کی ضد یعنی قومی ریاست کی بنیاد ڈال دی اور اس قدر شدّت کے ساتھ کہ قومی اور مذہبی شناختوں کا باہم یکجا ہونا ناممکن ہو گیا۔ اس کے باوجود مصالحت کی طرف کی ایک اور چیز یعنی موافقت یا رواداری بکسیلر میں اس موضوع پر ہونے والی ہر گفتگو کا جز و لازم ہے جہاں دونوں شناختیں ایک دوسرے کے ساتھ با آسانی مل گئی ہیں۔ سر تاس کے چچا اور کیونز ریئل اسٹیٹ کی سب سے بزرگ شخصیت رمضان گیونز کے مطابق ''اس ساری صورتحال میں کوئی الجھن نظر نہیں آتی'' اس کے بقول ''ساری کی ساری الجھن اس ملک میں خود ساختہ طور پر پھیلائی گئی ہے''۔

اس ملک کی ایک مختصر سی خوبصورت جھلک گیونز کے دفتر کی کھڑکی سے نظر آتی ہے۔ نیچے شارع عام اناطولیہ کے کسی بھی شہر کی گلی کی طرح دکھائی دیتی ہے یا پھر ان سب کا امتزاج لگتی ہے۔ ہفتے کے اختتامی دنوں میں مائیں سر پر رومال باندھے اور برساتیاں پہنے ہوئے اپنے کم سن ترین بچوں کا ہاتھ تھامے نظر آتی ہیں اور بچوں نے بزرگ ترین افراد کا ہاتھ تھاما ہوتا ہے۔ چھٹی والے روز خاندان گھرانے کے سربراہ کے پیچھے پیچھے رواں دواں ہوتا ہے جو کہ بڑے فخر سے دس سینٹی میٹر پیچھے کی طرف تن کر اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہا ہوتا ہے۔ پندرہ برس قبل ملبوسات کی عظیم الشان دوکانیں (ول پاور جینز) اور سیل فون فروخت کے مراکز جن گلیوں میں واقع تھے وہ کیچڑ سے بھرپور منظر کشی کرتی نظر آتی تھیں جہاں سے ٹریکٹر ہی گزر سکتے تھے۔ شہر میں جگہ جگہ نظر آنے والے چھ منزلہ عمارتوں کی آمد کے ساتھ ہی جو کہ استنبول کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہیں جو اونی غالیچوں کی نرم نرم ریشوں کے ساتھ ہے، یہ استنبول کا جز و لازم بن کر رہ گئیں۔ رمضان رکربٹیک نے1990 کی دہائی میں ان میں سے ''50 آ کو اس وقت تعمیر کیا تھا جب بکسیلر نے اس کی طرح دیہات سے سیدھے یہاں پہنچنے والے باشندوں کی اکثریت (تقریباً تمام کو) اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

بحیرہ اسود کے ساحل پر گندم کاشت کرنے والا یہ شخص استنبول میں تعمیرات کے کام کے دوران بہت سے سوالات پوچھ پوچھ کر خود بھی ماہر تعمیرات بن گیا اور ہر چار ماہ بعد خود بھی ایک عدد بلاک تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ ''اب ان عمارتوں میں آپ کو کوئی جانور نظر نہیں آئے گا'' جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والے ایک اور کاروباری ارکارن گیونز نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لوگ جلد ہی مطابقت اختیار کر لیتے ہیں''۔

یہ دنیا کا دستور ہے۔ ''ایک آدمی اپنا ٹریکٹر بیچ دیتا ہے، مویشی بیچ دیتا ہے، زمین بیچ دیتا ہے اور یہاں آ جاتا ہے''، یہ الفاظ میتن انس کے ہیں۔ ''وہ یہاں ایک علاقے میں کرائے کے مکان سے آغاز کرتا ہے، اپنا مکان بناتا ہے، سب سے نچلی منزل میں ورکشاپ کھولتا ہے، اور یوں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے''۔ انس کو اس طریقے سے کامیابی حاصل ہوئی جو کورم سے تعلق رکھنے کی بنا پر جرابیں بناتا ہے۔ اس نے اپنی ورکشاپ بالائی منزل میں کھولی ہے: جہاں تین حیرت انگیز طور پر پیچیدہ مشینیں متعلقہ سازو سامان کے تھیلوں کے ساتھ ہی عقبی کمرے کی روشنی حاصل کرتے ہوئے دھاگوں کے شاندار انباروں میں گھری ہوئی ہیں۔ نچلی منزل میں کوئی نصف درجن کے قریب خواتین مصنوعات کی تیاری میں مصروف ہیں جبکہ پاپ موسیقی پوری بلند آواز سے بج رہی ہے۔ جرابوں کا جوڑا بنا کر رکھنے اور پیک کرنے سے قبل ہر جراب کو ایک ہموار سطح کی مصنوعی ٹانگ پر چڑھا کر کس کے پھیلا دیا جاتا ہے۔ کونے میں بیٹھا ہوا آدمی لہراتے ہوئے قدموں سے یوں حرکت کرتا ہے جیسے کوئی برفانی ریچھ کسی بہت ہی چھوٹے سے پنجرے سے قید کارکنوں کو کام کے چھ دنوں پر مشتمل ہفتے کے 300 لیرے (190 ڈالر) معاوضہ ملتا ہے، جبکہ خاتون کارکن کو سو لیرے کم ملتے ہیں۔

اس طرح کی ملازمتیں بھی ہیں جو لوگوں کو اناطولیہ سے کھینچ لاتی ہیں۔ واپس مشرقی علاقوں کی طرف ''کام تو ہے مگر ملازمتیں نہیں ہیں'' یہ الفاظ ہاشم سیتماس کے ہیں جو چھ ماہ قبل اپنی گائیں فروخت کر کے یہاں پہنچا ہے تاکہ اپنے 9 عدد بچوں کے لئے چالیس ہزار ڈالر کے اپارٹمنٹ کی خرید کے لئے کچھ پیشگی رقم جمع کروا سکے۔ ترکی میں مصنوعات کے وسیع اور مہیب شعبے کی بدولت ملک کو خطے کی حقیقی طاقت بننے میں مدد ملی ہے، اور اردوان کی پارٹی کی برتر حیثیت کو تقویت دیتے ہوئے جس کو ترک عوام عقیدے سے زیادہ ملازمتوں کی فراہمی کے مواقع کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں، اس نے مزید تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مشرق وسطیٰ کا کونسا ایسا شہر ہے جہاں استنبولی فرنیچر سٹور نہ ہو۔

''ہر چیز ایک کاروبار ہے'' یہ بات متلو کیگیسز نے بکسیلر میں اپنے فوٹوگرافی سٹوڈیو کے کاؤنٹر کے عقب سے تبصرہ کرتے ہوئے کہی۔ اس کے پہلے نام کا مطلب ہے ''خوش وخرم''، اور وہ جب بولتا ہے تو اس کی آنکھیں مسلسل رقص کرتی رہتی ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کی انگلیاں بھی جن کو وہ

اپنی دوکان میں کھینچی گئی شادی کی ایک تصویر میں مناسب ترامیم کے لئے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر مسلسل متحرک رکھے ہوئے ہے جسے خوش نصیب جوڑے نے کبھی خود بھی نہ دیکھا ہوا اور ایسے مقامات میں باسفورس وغیرہ بھی شامل ہے جو کہ ایک انتہائی دلکش منظر کی حامل وہ آبنائے ہے جو استنبول کو دنیا سے متعارف کراتی ہے اور جسے یہاں آ کر بسنے والے افراد کی اندوہناک تعداد نے بچشم خود کبھی نہیں دیکھا۔ ''بہت سے لوگ یہاں روزانہ 12 سے 13 گھنٹے کام کرتے ہیں'' کیگیسز نے مزید تبصرہ کیا۔ ''یہ کوئی سست معاشرہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی ایسی حکومت نہیں ہے جو لوگوں کو کام نہ کرنے کا معاوضہ دیتی ہے، جیسا کہ یورپ میں ہوتا ہے''۔

شناختی کارڈ

یقیناً یورپ ہی اتاترک کے ترکی کا مثالی نمونہ تھا۔ ترکی کی بھی یہی خواہش تھی مگر یورپین یونین کو ایسا منظور نہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اور اتنا بڑا ملک اس مقصد کے لئے ناموزوں تھا۔ چنانچہ ترکی اپنی منزل کا تعین خود کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک اس ملک کو عرب سپرنگ والی قوموں کے لئے درونِ خانہ ایک جمہوری نمونے کے طور پر بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اتاترک کی جمہوریہ قرآن کے اس حکم کو کبھی بھی پورا نہ کرتی کہ مسلمان شریعت کے مطابق زندگی گزاریں۔

بعض لوگوں کو اردوان سے اس طرح کی امید ہوئی ہوگی۔ تاہم سیاسی اسلام کا وقت گزر چکا۔ کوئی بھی ترک باشندہ سرحد کے اس پار ایران کی طرف دیکھ سکتا ہے کہ وہاں بھی اتنی ہی آبادی پر مشتمل قوم رہ رہی ہے مگر کم تر آزادیوں اور امکانات کے ساتھ۔

سات عشروں تک ایک لادینی ماحول میں رہنے کے بعد بگسیلر سے یہ خبر ملی ہے کہ ترکوں کی اکثریت نے عقیدے کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دے کر خدا اور ملک کی محبت کے مابین کشمکش سے پیدا ہونے والے تناؤ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ ''یہ دل کے اندر ہوتا ہے'' یہ الفاظ رقیہ التواس کے ہیں جو بگسیلر میں واقع ٹیکسٹائل ورکشاپ میں اپنی شفٹ ختم ہونے کے بعد ابھی باہر نکلی ہے۔ وہ 24 برس کی ہے اور مشرقی علاقے میں 800 کلومیٹر دور واقع ایک مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ ریشمی رومال سر پر لپیٹے اور مخصوص انداز میں تیار کردہ خاکستری، رنگ کی برساتی میں ملبوس وہ پاکیزگی اور جدت کا حسین امتزاج دکھائی دیتی ہے۔

تاریخی روایات کے شہر طنجہ کی کشش

لیلیٰ لالامی

1977 میں جبکہ میں صرف نو برس کی تھی تو میرے والدین مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو شمالی مراکش میں طنجہ کی سیاحت کو لے گئے۔ یہ موسم گرما کا وسط تھا اور طوفانی ہوائیں پہاڑوں میں واقع شہر کی گلیوں سے گزر رہی تھیں جن کے ساتھ ہی تلی ہوئی مچھلی اور سگریٹ کی بو بھی شامل تھی۔ شہر کی قدیم بستی عدینہ میں خواتین چوڑے کناروں والے تنکوں کے ہیٹ پہنے اور سرخ و سفید دھاریوں والے کمبل کولہوں کے گرد لٹکائے گلیوں میں گھوم پھر کر پودینہ اور کدّو بیچتی پھر رہی تھیں۔ لڑکے ان کھلے ڈبوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے جو اسپین سے آنے والی ممنوعہ اشیاء، یعنی ٹرانسسٹر ریڈیو، پلاسٹک کی گھڑیوں، استعمال کے بعد ناکارہ ہو جانے والے استروں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کی قیمتیں درہم کی بجائے ریال میں بتا رہے تھے جو کہ پرانی کرنسی شمار کی جاتی تھی۔ اپنی دوکانوں کے باہر ادھیڑ عمر دوکاندار جن کے لبادوں کے ساتھ لگے ہوئے قصابے ان کے کانوں کے پیچھے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے، میٹھی نرم آوازوں سے بولتے تھے جن میں حروفِ علت (Vowels) طویل اور حروف صحیح (Consonants) نرم لہجے سے ادا کئے جاتے تھے۔ دارالحکومت رباط سے تعلق رکھنے والی چھوٹی سی بچی کے لئے لباس، رسوم و رواج اور بولیوں میں یہ علاقائی فرق اس امر کا ثبوت تھا کہ طنجہ ایک مختلف شہر تھا۔ طنجہ تاریخی روایات کا حامل تھا۔ طنجہ پر فسوں شہر تھا۔

اسی سال میں نے اپنے تصویری انسائیکلو پیڈیا میں یونانی اساطیر بشمول ہرکولیس کا

مطالعہ کیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنی 12 ریاضتوں کے اختتام پر اس نے طنجہ کے قریب آکر آرام کیا۔ لہذاء جب اگلے روز ہم شہر سے 14 کلومیٹر دور ہرکولیس کے غار دیکھنے گئے تو خاص طور پر پرجوش تھی۔ ہمیں اندر جا کر جو نظارہ دیکھنے کے علاوہ قابل دید تھا: دیوار کے اندر افریقہ کی الٹی شکل کی طرح کا ایک خلاء جس کے مقابل فیروزی مائل نیلے آسمان اور گہرے نیلے بحراوقیانوس کی شبیہ دکھائی گئی تھی۔ جبکہ میں اپنے والد کا ہاتھ تھامے ڈر رہی تھی کہ کہیں گہرے پانی میں نہ گر پڑوں، چند نوجوان لڑکوں نے بڑی دلیری سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ آیا ہرکولیس کے غار ایک ارضیاتی عجوبہ تھا یا انتہائی باہنر قبائل کی جانفشانی کا نتیجہ کوئی بھی میرے سوال کی تشفی نہ کر سکا۔ طنجہ میں افسانے اور حقیقت کے مابین بہت خفیف فرق پایا جاتا ہے۔

ہرکولیس وہ واحد سیّاح نہیں تھا جسے شہر کے اندر جنت ملی تھی۔ رومن یہاں ایک صدی قبل مسیح پہنچے تھے، پھر جرمن غارت گر، بنو اُمیہ، بنو عباس، ادریسی، مرینیدیسی اور بہت سی دیگر بادشاہتیں، بربر یا عرب مسلمان یا عیسائی، مقامی یا غیر مقامی لوگ آئے، پرتگیزی پندرھویں صدی میں حملہ آور ہوئے، اس سے قبل وہ اور خود طنجہ کے لوگ بھی ہسپانوی حکومت کے زیرنگیں آگئے تھے۔ چند برس بعد انگریز آگئے۔ یہ سب ایک ہی چیز کے طلبگار تھے: ایک ایسا شہر جس کا براعظم کے عین سرے پر وقوع انہیں اس قابل بنا دے گا کہ وہ اندرون ملک سے ہونے والی بہت سی تجارت کو کنٹرول کرسکیں گے۔

اور وہ سب پھر وہاں سے چلے بھی گئے، اگرچہ ہرکولیس کی طرح وہ اپنی کچھ نہ کچھ یادگار یا نشانی طنجہ میں چھوڑ گئے۔ ہسپانویوں نے 1400 نشستوں پر مشتمل تھیٹر (Gran Teatro Cervantes) بنوایا جہاں ان کے موسیقی اور اوپرا کے سب سے بڑے ستاروں نے دو عظیم جنگوں کے درمیان اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ برطانویوں کی یادگار چرچ آف سینٹ اینڈریو ہے جو اس قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جو انہیں سلطان نے عطیہ کیا تھا، اور جس کا بیل ٹاور ایک مینار کی طرح نظر آتا ہے۔ طنجہ آپ کو اپنی طرف راغب کرتا ہے، اور پھر پرے دھکیل دیتا ہے، آپ کو دوبارہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے۔ حتیٰ کہ تقریباً 25 برس دور رہنے کے بعد، اس کا مشہور ترین سپوت، ابن بطوطہ بھی واپس لوٹ آیا تھا۔

یہی کچھ میں نے کیا، بار بار۔ میں ابھی دو برس قبل بھی طنجہ میں تھی، اس مرتبہ اپنے خاوند

کے ساتھ۔ پہلی نظر میں مجھے شہر ویسے کا ویسا نظر آیا جیسا کہ میں اسے چھوڑ کر گئی تھی: مدینہ کی گلیاں آہستہ آہستہ ظہر کی نماز پڑھ کر آنے والے نمازیوں سے بھرتی جا رہی تھیں، وہ کیفے جہاں ایک آدمی خاموشی سے بیٹھا سبی (حشیش پینے کا پائپ) پی رہا تھا۔ تاہم ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ مدینہ کے بہت سے قدیم گھر قیام وطعام کے مراکز میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان کے یوروپی مالکان نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق انہیں نئے انداز میں از سرِ نو تعمیر کروایا تھا۔ دی کیفے سنٹرل، جہاں ایک روایت کے مطابق امریکی ناول نگار ولیم برو(William Burroughs) نے سرور آمیز کش لئے تھے اور جو تھکا ماندہ اور بدوضع چلنے میں نظر آنے کی شہرت رکھتا تھا، بہت قابل احترام دکھائی دیا؛ مرد اور عورتیں اس کے میٹرس پر بیٹھے لیمنیڈ کی چسکیاں لے رہے تھے۔

مدینہ چھوڑتے ہوئے میں ''گران ساکو'' سے گزر کر ''سینمارف'' تک گئی جو کہ مراکش کے بصری فنکار یٹو برّاڈا(Yto Barrada) کے زیرِ انتظام ہے۔ میں نے پودینے والی چائے کا آرڈر دیا اور وہاں پینے کے لئے بیٹھ گئی۔ وہاں دیوار پر لگے ہوئے ایک رنگین پوسٹر سے مجھے فلائٹ ٹو طنجہ میں مسکراتا ہوا جیک پیلنس گھورتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہدف، اپنی تمام ترٹیکنی کلر شان و شوکت کے ساتھ، گمشدہ خزانہ بازیاب کرنا تھا۔ میرے خیال میں شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ابھی تک لوٹ کر یہاں آتے رہتے ہیں: انہیں محسوس ہوتا ہے جیسے طنجہ میں وہ اپنا کچھ بھول گئے ہیں۔

صومالیہ کے سمندری بھیڑیئے

ایلکس پیری۔ گلکایو

میں نے کسی حد تک بے محل انداز میں، اپنے قزاقوں سے صحرا میں ملاقات کا انتظام کر لیا ہے۔ میں 1960 کے زمانے کے پنکھے والے جہاز پر سوار ہوتا ہوں جس میں بکریوں کی بدبو پھیلی ہوئی ہے اور جسے چار عدد لحیم شحیم روسی چلا رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مختلف منزلوں پر رکتے ہوئے ہم صومالیہ کے اجاڑ شمالی علاقوں سے گزر کر گلکائیو کے چھوٹے سے شہر کے باہر سرخ مٹیالے قطع اراضی کو چھوتے ہیں۔ دارلحکومت موغادیشو میں حکومت دور دراز کے مضافاتی/ساحلی علاقوں کو چھوڑ، نصف شہر کو بھی کنٹرول نہیں کرتی اور ہمارے پہنچنے سے ایک دن قبل گلکائیو میں بندوقوں سے ہونے والی جھڑپ میں سات افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ہوائی اڈے پر اترتے ہی میں پہلے 15 ڈالر یومیہ پر اے کے۔47 سے مسلح آٹھ محافظوں کی خدمات حاصل کرتا ہوں اور پھر شہر کے دوسرے سرے پر اونچی دیواروں والے اجتماعی احاطے کی طرف گامزن ہو جاتا ہوں جہاں میرا قیام رہے گا۔ یہاں میں ایک مشہور زمانہ قزاق محمد نور سے ملوں گا جو کہ اپنے ساتھوں میں فرائیرے یا پنجہ کے نام سے معروف ہے۔ میں اس سے مل کر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ صومالیہ کے قزاقوں کو بین الاقوامی بحری بیڑے کا سامنا درپیش ہے اور ایک ہزار کے قریب قزاق گرفتار ہونے کے ساتھ ہی سینکڑوں ہلاک ہو چکے ہیں، قزاقی ابھی تک

کیسے عروج پر ہے۔

پنچہ اکیلا ہی آتا ہے۔ وہ دبلا پتلا ہے اور 32 برس کی عمر میں ہی دھوپ سے جسم پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں، چائے پیالوں میں انڈیلی جاتی ہے اور پنچہ مجھے آغاز کرنے کا عندیہ دیتا ہے۔ تم قزاقی کے لئے عملہ کس طرح جمع کرتے ہو؟ میں سوال کرتا ہوں۔ قزاقی کے لئے کوئی متعین عملہ نہیں ہے۔ پنچہ جواب دیتا ہے۔ اس کی بجائے کچھ سرمایہ کار ہیں جو رقم اکٹھی کرتے ہیں تاکہ دو کشتیاں بمعہ انجن کرائے پر حاصل کرنے کے ساتھ ہی 5 تا 10 نوجوانوں کی خدمات بمعہ اسلحہ حاصل کی جاسکیں۔ جو کوئی بھی اپنی خدمات پیش کر دے ہم انہیں ایک ماہ کیلئے کافی خوراک، پانی اور ایندھن فراہم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد سرمایہ کار اپنے قزاقوں کو ان احکامات کے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں کہ جب تک کوئی بحری جہاز ہاتھ نہ آئے وہ واپس نہ آئیں گے۔ بس یہی کرنا ہوتا ہے۔ سینکڑوں قزاق واپس ہی نہیں لوٹتے، پنچہ تبصرہ کرتا ہے۔ بعض سمندر میں ڈوب جاتے ہیں اکثر کو خوراک، پانی اور ایندھن کی قلت ہو جاتی ہے اور ان کے فاقہ زدہ مرجھائے ہوئے جسم سمندر پر تیرتے نظر آتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک ایسے قزاق گروہ میں جو کہ میرا جانا پہچانا تھا، خوراک کی قلت ہوگئی اور ایک قزاق موت کے منہ میں جا پہنچا جسے باقی قزاقوں نے کھالیا۔ پنچہ نے صومالی زبان میں مترجم کی وساطت سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے دوست کو کھا گئے؟'' میں نے سوال کیا پنچہ ہنسنے لگا۔ ''اگر آپ مرنے کے قریب ہوں تو یہ کوئی جرم نہیں ہے'' اس نے وضاحت کی۔

پنچہ کہنے لگا کہ اس نے معاوضے پر بہت سے قزاقوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے اب تک کتنے بحری جہاز پکڑے اور تاوان وصول کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک جہاز سے اس نے 75000 ڈالر کا حصہ وصول کیا اور دوسرے سے 280,000 ڈالر۔ یوں کل 355000 ڈالر میں سے اس نے 50,000 ڈالر نیروبی میں، جو کہ کینیا کا دارالحکومت ہے، سودی کاروبار میں لگا دیئے۔ اس کے بعد بھی 300,000 ڈالر سے زائد رقم بچ گئی، جو کہ کسی جگہ اچھی خاصی کمائی لگتی ہے مگر صومالیہ میں جو کہ دنیا کی ناکام ترین ریاست ہے، یہ کسی انمول خزانے سے کم نہیں ہے۔ صومالیہ وہ ملک ہے جو گزشتہ 20 برس سے خانہ جنگی کی شکار ہے اور جہاں سالانہ

آمدنی بھی چند سو ڈالروں سے زیادہ نہیں بڑھتی ۔ تاہم جب میں پنجے کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے وہاں دولت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہے اور اس کا حلیہ بھی عرشے پر کام کرنے والے کسی مشرقی افریقی مزدور جیسا ہی ہے: سستا سا نیکر نما جامہ، پتلی سی قمیض اور ایک پرانی سی کیکوئی۔

''پنجہ'' میں پوچھتا ہوں،''ساری رقم کہاں چلی گئی؟'' ''گئی'' وہ ہنستا ہے۔

''تم نے ساری خرچ کر دی؟''

میں نے مکان اور گاڑیاں خرید لیں۔ میں نے دو عدد لینڈ کروزر خریدی ہیں۔ میں دوستوں پر خرچ کر دی ہے۔ مجھے اس میں لطف آیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک ایک قزاق ہوں۔ علاوہ ازیں یہ مزے کا کام ہے۔'' پھر پنجہ مسکراتا ہے اور کندھے اچکا کر مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو: تمہیں ایک قزاق سے اور کیا توقع تھی؟ ذمہ داری کی؟

صومالیہ کا مرض اور علامات

مشرق اور مغرب کے درمیان تجارتی راستے کے دونوں اطراف میں بحیرہ ہند صدیوں سے قزاقوں کی پسندیدہ آماجگاہ چلا آ رہا ہے جیسا کہ ری یونین (Reunion) اور سیچلیز پر قزاقوں کے قبرستان گواہی دیتے ہیں۔ تاہم صومالی قزاق ابھی حال کا قصہ ہیں۔ جب ابن بطوطہ نے سولہویں صدی عیسوی میں موغادیشو کا سفر کیا تو یہ شہر اس زمانے میں بربر باشندوں کی پہچان بن چکا تھا جو کہ اپنے تاجروں اور جولاہوں کی وجہ سے مشہور تھا اور صومالی باشندے شکاری سے زیادہ شکار ہی بنے رہتے ہوں گے۔

مگر اب صورتحال یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ صومالیہ میں 1991 سے کوئی مرکزی حکومت نہیں ہے۔20 برس کی خانہ جنگی جو کہ پہلے مقامی جنگجوؤں اور اسلامی مجاہدین کے درمیان برپا تھی رخ بدل کر اقوام متحدہ اور امریکہ کے خلاف جنگ بن چکی ہے اور اس سے بھی آگے اب افریقن یونین اور القاعدہ سے منسلک تنظیم الشباب کے مابین جنگ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ انتشار اور لاقانونیت جو کہ اس طرح کی تاریخی صورتحال کے مضمرات کے طور پر سامنے آتے ہیں جائز طریقے سے روزی کمانے کے مواقع میں کمی کا باعث بن جاتے ہیں اور یوں اسلحہ اور منشیات کی ناجائز

تجارت اور قزاقی صنعت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

کوالا لمپور کے انٹرنیشنل میری ٹائم بیورو کے مطابق صومالی قزاقوں نے 2011 کے پہلے 3 ماہ کے دوران 117 بحری جہازوں پر حملے کئے۔ یہ اب تک کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے جو کہ گزشتہ برس اسی عرصے کے دوران ہونے والے حملوں میں دوگنا اضافہ ظاہر کرتا ہے اور یوں صومالیہ میں مقبوضہ جہازوں کی تعداد 28 اور سمندری عملے کی تعداد بڑھ کر 600 تک پہنچ گئی ہے۔(گزشتہ پورے عشرے کے دوران یہ تعداد بالترتیب 160 اور 4000 ہے) قزاق نہ صرف حملوں کی تعداد میں اضافہ کر رہے بلکہ ان کی سرگرمیوں کی حدود بھی وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ اب جہازوں کو بحر ہند سے آگے جنوب میں موزمبیق تک، شمال میں متحدہ عرب امارات تک اور مشرق میں بھارت تک لے جاتے ہیں۔ اور اس قدر وسیع علاقے کی نگرانی پولیس کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور جیسا وہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، قزاق عالمی تجارت کی ایک شریان کو ہدف بنا رہے ہیں: چالیس فی صد سمندری تجارت یا روزانہ 300 مال بردار بحری جہاز مشرق اور مغرب کے درمیان بحر ہند کے راستے سے گزرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ بحری جہازوں کے مالکان یا ان کے بیمہ ایجنٹ قزاقوں کو جو تاوان ادا کرتے ہیں وہ قزاقی کی اصل لاگت کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ خطرات کے حوالے سے مشاورت کرنے والی کمپنی جیو پالیسیٹی (Geopolicity) کے مطابق بڑھتے ہوئے بیمہ کی بڑھتی ہوئی لاگت، اضافی حفاظتی اقدامات حملوں سے بچنے کے لئے طویل راستے اختیار کرنا، اور ان سب کے نتیجے میں درآمد/برآمد کی جانے والی اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتیں یہ سب مل ملا کر کوئی 4.9 ارب ڈالر سے 8.3 ارب ڈالر بن جاتے ہیں۔

بڑھتا ہوا جانی نقصان اس کے علاوہ ہے۔ ماضی میں اگرچہ صومالی قزاق تشدد سے حتیٰ الوسع احتراز کرتے تھے تاہم جنوری سے مارچ کے دوران وہ سات ملاحوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ بحری راستوں سے تجارت کرنے والے افراد بھی کئی بار مار پیٹ اور تشدد کی شکایت کر چکے ہیں، حتیٰ کے جہاز کے پیندے کو نقصان پہنچانے کی شکایات بھی آ چکی ہیں۔ جانی نقصان میں اضافے کی ایک وضاحت تو یہ ہے کہ قزاقوں کے مطابق اس طرح سے تاوان جلدی اور زیادہ وصول ہوتا ہے اور کچھ حد تک قزاقوں اور 25 اقوام پر مشتمل قزاقی مخالف تنظیم کے بحری بیڑے سے تعلق رکھنے والے بیرونی جنگی جہازوں کے مابین روابط کی مہلک نوعیت اس کی ذمہ دار

ہے۔جنوری میں جنوبی کوریا کے کمانڈو سپاہیوں نے ایک اغواء شدہ تجارتی جہاز سے 21 قیدیوں کو چھڑاتے ہوئے آٹھ قزاقوں کو ہلاک کرڈالا۔فروری میں امریکی فوجیوں نے قریب سے گھیراؤ کیا تو قزاقوں نے دنیا کی سیر پر نکلے ہوئے چار امریکی سیاحوں کو ہلاک کر دیا۔جب شمالی صومالیہ کے ایک نیم خود مختار علاقے پینٹ لینڈ کی فوجوں نے انجن سے چلنے والی کشتی میں سوار ڈنمارک کے ایک جوڑے، ان کے 13 سے 17 برس کے تین بچوں، اور دو عدد اور بالغ افراد کو چھڑوانے کی کوشش کی تو قزاقوں کے ایک گروہ نے 5 فوجیوں کو ہلاک کرڈالا۔مئی میں قزاقوں اور یو۔ایس۔ایس سٹیفن۔ڈبلیو۔گرووز کے درمیان جو کہ قزاقی مخالف گشتی بیڑے کا حفاظتی جہاز ہے، گولیوں کے تبادلے کے نتیجے میں ایک تائیوانی کپتان ہلاک ہو گیا تھا۔

صحافتی اتحاد

پنچہ سے ملاقات سے چند روز قبل ممباسا کے پرانے قصبے کے سرے پر واقع ایک کینین کیفے میں مجھے قزاقوں کی بڑھتی ہوئی جفاکشی کے براہ راست واقعات سننے کا موقع ملا۔گزشتہ برس جوزف ایمری نامی شخص کینیا کے شمالی ساحلوں پر مچھلیاں، کیکڑے اور جھینگے وغیرہ پکڑنے والے گولڈن ویو نامی 300 ٹن وزنی اور 85 میٹر طویل ماہی گیر ٹرالر پر مامور عملے کے 39 ارکان میں سے ایک تھا۔9 ستمبر کی ایک صبح طلوع ہوتے ہی ایمری نے دیکھا کہ دو عدد کشتیاں افق کے اس پار تیرتی ہوئی جارہی ہیں۔اس نے چند دوربینیں پکڑلیں۔وہ کہتا ہے کہ ''اسے پانچ یا چھ آدمی نظر آتے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار ہیں''۔ان میں ''دو عدد آر پی جیز، دو عدد بھاری مشین گنز، اور چھ اے کے 47 رائفلیں شامل ہیں۔وہ فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ہمیں رکنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ کپتان بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، مگر قزاق ایک طرف سیڑھی لگا کر جہاز پر چڑھ آتے ہیں۔''اگر تمہیں اپنی زندگیاں عزیز ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کرو یا پھر تم سب مارے جاؤ گے''، انہوں نے تنبیہ کی۔''ہم کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے، مگر ہم پہلے تمہیں ہلاک کریں گے۔''

اس کے بعد قزاق گلکائیو سے ایک دن کی مسافت پر واقع ایک نجی پناہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔وہاں شہر کے بزرگ افراد کا ایک گروہ جہاز پر چڑھ آیا اور صومالیہ کے سمندر سے

مچھلیاں پکڑنے پر عملے کو برا بھلا کہا اور کپتان کے سامنے تین تجویزیں رکھ دیں: ''ہمارے ساتھ تعاون کرو اور اپنے جہاز کے ذریعے ایک ٹینکر اغواء کرو۔ ہمیں 60 لاکھ ڈالر ادا کرو۔ یا پھر ہم تمہاری گردن کاٹ کر جہاز ڈبو دیں گے۔

یہ ہے وہ پس منظر جو گولڈن ویو کے قزاقوں کی ماں بننے کے امر کی وضاحت کرتا ہے۔ اگلے 6 ماہ کے لئے ایمری اور اس کے عملے کے ارکان کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے قزاق بحیرہ ہند میں گھومتے رہے۔ سب سے پہلے 24 اکتوبر کو ان کی زد میں جو جہاز آیا وہ سنگاپور کے جھنڈے والا 5076 ٹن ایل این جی کیس لے جانے والا ٹینکر 'دی پارک' تھا جو کہ ممباسا کے پاس لنگر انداز تھا۔ اس کے بعد گولڈن ویو سیچلیز کی طرف روانہ ہو گیا جہاں 21 دن تک شب خون مارنے کی 17 کوششوں کے بعد جو سب ناکام ہو گئیں قزاقوں نے 22 جنوری کو ایک جرمن کارگو جہاز دی بیلوگا نومینیشن پکڑ لیا۔ اغوا کی اس واردات میں اس وقت تشدد کا عنصر شامل ہو گیا جب سیچلیز کوسٹ گارڈز نے فائرنگ شروع کر دی: ایک قزاق اور عملے کے دو افراد مارے گئے۔ دو دن بعد قزاقوں نے مچھلیاں پکڑنے والی ایک ایرانی کشتی اغواء کر لی۔ اس کے بعد وہ مچھلیاں پکڑنے والی ایک پاکستانی کشتی پر چڑھ گئے اور اس کا ریڈیو، لیپ ٹاپ اور ایندھن چرا لیا۔ آخر کار ایندھن کی کمی محسوس کرنے پر انہوں نے ایک تیسرے جہاز پر حملہ کیا۔ ایمری کا کہنا تھا اس بار وہ خود بھی قزاقوں کے ساتھ شامل تھا اگر چہ بندوق کے زور پر۔

فروری کے ابتدائی دنوں میں قزاق ہارادھیری کی جانب واپس لوٹ آئے۔ جشن کے دوران پینے پلانے، ناچتے گاتے فائرنگ کرتے اور قط (ایک جوش دلانے والا مواد) چباتے ایک قزاق کو کینیا کے عملے کے ارکان پر رحم آ گیا۔ ایمری کا کہنا تھا کہ قزاق نے اسے سٹلائیٹ فون اور ایک دن کے لئے کافی ایندھن دیا اور گولڈن دیو ہارادھیری سے باہر ہو لیا۔ جب وہ ایک مرتبہ سمندر پر پہنچے تو عملے نے فن لینڈ کے ایک جنگی جہاز سے حفاظت طلب کی اور آخر کار وہ 6 ماہ کے بعد 17 فروری کو ممباسا واپس لوٹ آئے۔

سطحی تناؤ

قزاقوں کی بظاہر بلاخوف وخطر کاروای کرنے کی صلاحیت ایک بے چین کر دینے

والے احساس کی عکاسی کرتی ہے جو کہ اب دنیا کی تمام بحری افواج میں بیدار ہو رہا ہے: اور وہ یہ کہ 21ویں صدی میں بھی جبکہ جنگی جہاز ٹریپولی میں پرانے شہر کی کسی کھڑکی سے کروز میزائل چلایا جا سکتا ہے، قزاقی کو کنٹرول کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ پیٹر ہینکلف، سیکرٹری جنرل آف دی انٹرنیشنل چیمبر آف شپنگ اینڈ دی انٹرنیشنل شپنگ فیڈریشن کا کہنا ہے کہ اگرچہ جنگی جہازوں کے تحفظ کی بدولت خلیج عدن سے ایک محفوظ راستہ مل گیا ہے مگر ''کسی نے یہ نہیں پوچھا'' کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو قزاق کیا کریں گے؟ اور یقیناً وہ کسی اور جانب نکل جائیں گے۔

بیڑے کے اہم جہازوں کو ہدف بناتے ہوئے ہینکلف اظہار رائے کرتا ہے کہ اگر دنیا کی تمام بحری افواج کسی تجویز پر متفق ہو بھی جائیں تو پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ صرف فوجی طاقت سے قزاقی ختم کی جا سکتی ہے۔ جب بین الاقوامی بحری بیڑے نے قزاقوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی تھی تو کینیا نے شروع شروع میں ان کو رضا کارانہ طور پر قید کرنا شروع کر دیا تھا مگر بعد میں جب یہ پتہ چلا کہ ان کی تعداد کس قدر زیادہ ہو گی تو تعاون ختم کر دیا گیا: یو این آفس فار ڈرگز اینڈ کرائمز (UNODC) کے مطابق صرف مئی 2011 میں یہ تعداد 1007 تھی۔ مسئلے کے حجم کے پیش نظر یو این او ڈی سی نے ہرگیسیا، صومالیہ میں ایک عدد جیل دوبارہ کھول دی ہے جس میں 460 قیدی رکھے جا سکتے ہیں۔ قزاقوں کی ایک چھوٹی سی تعداد بھی امریکہ سے لے کر جاپان تک 20 ممالک کے نظام انصاف میں نکلنے کی راہ تلاش کر رہی ہے۔ تاہم قزاقی کی سرگرمیاں حد سے آگے بڑھ چکی ہیں۔ اگر یو این او ڈی سی کی گنتی کے مطابق اس وقت صومالی قزاقوں کی تعداد 2500 کے قریب ہے، تاہم ان بیروزگار صومالیوں کی تعداد جو کسی بھی قزاق کے جیل جانے کی صورت میں اس کی جگہ لے سکتے ہیں سینکڑوں ہزار تک جا پہنچتی ہے۔

قزاقی کے خاتمے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بہت پرکشش ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ جہاز چند ہزار ڈالر دے کر آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ مگر آج کل ایک ٹینکر چھڑانے کے لئے 50 لاکھ سے ایک کروڑ ڈالر ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ہینکلف کے اندازے کے مطابق 2010 کے دوران کل ادا کئے جانے والے تاوان کی رقم 7.5 کروڑ ڈالر سے 23 کروڑ 80 لاکھ ڈالر بنتی ہے اور ایک قزاق سرمایہ کار کا منافع 10,000 فی صد۔ چونکہ ملاحوں کو رہا کرانے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہوتا اس لئے جہاز مالکان یا ان کے بیمہ

ایجنٹوں کی طرف سے تاوان ادا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔الن کول نے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا جو کہ یو این او ڈی سی کا نیروبی سے تعلق رکھنے والا قزاقی امور کا ماہر نمائندہ ہے: بحری جہاز مالکان کے مطابق لوگوں کو رہا کروانے کے لئے تاوان کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔جبکہ حکومت کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر آپ یونہی تاوان ادا کرتے رہیں گے تو پھر اس سرگرمی کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں نکلے گا۔

تاہم حال ہی میں آنے والی ایک ڈرامائی تبدیلی اس سارے رنگ میں بھنگ ڈال کر عروج کی طرف گامزن اس صفت کو زوال سے دوچار کرسکتی ہے: تسلسل سے سننے میں آرہا ہے کہ الشباب اب قزاقوں پر ٹیکس لگا کر خود اپنے طور پر اس سرگرمی میں سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ نیروبی سے تعلق رکھنے والے قزاقی کے ایک ماہر کے مطابق حال ہی میں گرفتار ہونے والے تمام افراد کسمایو سے برآمد ہوئے تھے۔(کسمایو الشباب کے زیر کنٹرول جنوبی صومالی بندرگاہ کا نام ہے)۔جو کوئی بھی القاعدہ سے تعلق رکھنے والے گروہ جو اس وقت ایک بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم کی صورت اختیار کر گیا تھا جب اس نے گزشتہ برس یوگنڈا کے شہر کمپالا میں ایک بم دھاکے کے ذریعے76افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا،اس پر مغرب میں مقدمہ چلایا جائے گا۔تاہم اگرچہ الشباب کے ملوث ہونے کے بعد تاوان کا کاروبار ماند پڑسکتا ہے، لیکن یہ مکمل طور پر ختم نہیں ہو پائے گا۔شمالی صومالیہ کے بہت سے قزاقوں کا الشباب سے کوئی تعلق نہیں ہے ہیبت ناک مناظر حوصلہ شکن ہیں۔ ینکلف ایک اغواء شدہ آئل ٹینکر کے حوالے سے ماحولیاتی تباہی کی قیاس آرائی کرتا ہے۔کول کے مطابق اغواء شدہ کروز شپ پر بڑے پیمانے پر انسانی تباہی کا خطرہ ہے۔اینڈر یو مآنگورا، جو ممباسا سے تعلق رکھنے والا قزاقی کی سرگرمیوں کا آزاد نگران ہے،ایک ایسی صورتحال کی منظر کشی کرتا ہے جس میں دہشت گرد اغواء شدہ بحری جہازوں کی مدد سے خلیج عدن کا راستہ سب سے تنگ مقام یعنی30 کلومیٹر طویل باب المندب پر بند کرسکتے ہیں۔

نجی جنت

مدغاسکر کے شمالی ساحل پر ایک ایسی خلیج یا کھاڑی ہے جس کے گھنے جنگلات میں، ایک روایت کے مطابق، لبرتالیا کے آثار پوشیدہ ہیں۔ کوئی 300 برس قبل بھر ہند یورپی قزاقوں کی

پسندیدہ آماجگاہ تھی جن کی گزراوقات کھلے سمندروں میں کاروائیاں کر کے ہوتی تھی۔ تاہم جیسا کہ کیپٹن چارلس جانسن نے 1724 میں ''جنرل ہسٹری نوٹوریئس پائیریٹس'' میں ذکر کیا ہے، قزاقی کوئی اتنی انوکھی اور حیران کن سرگرمی نہیں تھی۔ جانسن نے لبرتالیا کے بانیوں سابقہ نیوی آفیسر جیمز مسن اور ایک کالعدم عیسائی پادری، سگنر کیراسیولی کو جو سمندری سفر میں اس کے ساتھ ہوتا تھا، انقلابی شخصیات کے طور پر پیش کیا ہے، کیراسیولی ایک طرح سے انتہا پسند خیالات کا حامی تھا اور اس نے مشن اور اس کے عملے کو قائل کیا ''کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر ضروری چیز پر اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس ہوا پر جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ انسانوں کے درمیان پائے جانے والے وسیع تفاوت کی جس میں ایک سمت تو عیش وعشرت کے مزے لینے والے ہوتے ہیں اور دوسری سمت وہ جو بمشکل ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں واحد وجہ ایک تو وہ طبقہ ہے جو حرص و ہوس کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسرے وہ طبقہ جو ان کی بزدلانہ اطاعت پر مجبور ہے۔'' کیراسیولی نے آدمیوں کو ترغیب دی کہ وہ ڈکیتی یا قزاقی کے ذریعے دولت مندوں کو سزا دیں اور اپنی آزادی چھین لیں۔ اپنے اس فریب نظر کے زیراثر انہوں نے مڈغاسکر میں ایک خیالی جنت تعمیر کی جس میں بادشاہوں اور کپتانوں کی جگہ باری باری حکومت کرنے والے رہنماؤں نے لے لی'' مذہب کی درجہ بندی ختم اور نجی دولت پر پابندی لگا دی گئی۔ مشن کے عملے کے لوگ، کیراسیولی کے اعلان کے مطابق ''اب قزاق نہیں رہے تھے بلکہ ایسے لوگ بن گئے تھے جو اس امر پر اصرار کرنے کا عہد کئے ہوئے تھے کہ خدا اور فطرت نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا اور وہ امیر اور بالا دست طبقے کے خلاف نبرد آزما تھے''۔

لبرتالیا کافی حد تک ایک پراسرار داستان کی طرح ہے۔ اس کے آثار کبھی دریافت نہیں ہوئے، خود مشن کا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی وجود نہ ہو، اور چارلس جانسن ایک فرضی نام ہے، شاید ڈینیئل ڈیفو کا۔ تاہم اس روایتی قصے میں کچھ حد تک سچائی کا عنصر موجود ہے۔ سترھویں صدی میں کچھ انگریز باغیوں نے مڈغاسکر میں رینٹر نامی خلیج میں ایک بستی آباد کی تھی جہاں انہوں نے رسمی مذہب کو خیر باد کہہ دیا اور قزاقی شروع کر دی۔ لبرتالیا میں جن تصورات کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ سترھویں صدی کے کسی بھی باغی کے لئے جانے پہچانے ہوں گے۔

لبرتالیا ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جو قزاقی کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف

ہیں۔ مشن کے لوگوں کے لئے قزاقی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی، یعنی ظلم و جبر کے خلاف جنگ اور ایک ایسے مستقبل کی تعمیر جہاں انصاف اور خوش حالی کا دور دورہ ہو۔ اسی طرح صومالیہ کے قزاق بھی اکثر یہی دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ پنچہ نے کیا تھا کہ وہ سابقہ مچھیروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ان ماہی گیر ٹرالرز پر حملہ کیا تھا جو صومالیہ کے سمندر میں مچھلیوں کے ذخائر کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ یہ پہلے ایک حقیقت تھی مگر اب ایسا نہیں ہے: اغوا ہونے والے عملے کا کہنا ہے کہ بہت سے قزاقوں کو ملاحی تو دور کی بات، تیرا کی تک نہیں آتی اور مچھلیوں کے ان ذخائر کی بحالی سے جو قزاقی کے مزاحمتی اثرات کی بناء پر خطرے سے دوچار تھے صومالیہ کی ماہی گیری کی صنعت پر کوئی مثبت اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ تاہم یہ نظریہ کہ عالمی سطح پر صومالیہ سے ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا ہے اور یہ کہ جب تک صومالی باشندوں کی جائز شکایات کا ازالہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک قزاقی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، کافی حد تک درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاجروں کی ایک تنظیم، دی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف انڈی پنڈنٹ ٹینکر اونرز کے چیئرمین، گراہم ویسٹ گارتھ کے مطابق، ''اس مسئلے کا حقیقی حل زمین پر پایا جاتا ہے''۔

اس کے لئے کوئی ہوائی قلعہ تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس سے بھی سادہ تصور یعنی تھوڑی سی کم لاقانونیت، تھوڑی سی زیادہ ترقی کی بدولت عمر محمود عمر سوری جو کہ برمنگھم'' برطانیہ میں آئی ٹی ٹیچر رہا ہے۔ عمر کے مطابق ''قزاقی کی بنیادی وجہ ساحلی علاقے ہیں ایک سخت گیر قانون کی عدم موجودگی ہے''۔ ایک موثر قومی حکومت کے فقدان کی بناء پر مایوس ہو کر عمر اور چند ایک منتخب کردہ قبائلی رہنماؤں نے مرکزی صومالیہ میں گلمدگ نامی ایک نئی ریاست قائم کر لی ہے، جس کے مرکز میں 400 افراد پر مشتمل ایک نئی پولیس فورس کام کر رہی ہے۔ عمر کو امید ہے کہ یوں تو ریاست کی سطح پر معمول زندگی بحال کرنے کی بنیاد رکھ دی جائے گی جس کا نتیجہ آخر کار قانونی کاروباری سرگرمیوں اور ملازمتوں کی صورت میں برآمد ہوگا۔ ان کی اس پیش قدمی کو صومالی باشندوں، حتیٰ کہ قزاقی کے کام سے منسلک افراد کی بھی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ چالیس سالہ آدر عبدالرحمٰن، عبدالولی عبدالقادر موسیٰ کی ماں ہے، جسے فروری میں نیویارک کی ایک جیل میں 33 برس قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ آدر کے مطابق اس کا بیٹا صرف 15 برس کا ''کم سن فوجی'' تھا جب وہ قزاق بنا اور محض 16 برس کی عمر میں یو ایس سپیشل آپریشن ٹیم کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ وہ کہتی ہے کہ ''اگر قزاقی کی

سرگرمیوں کی روک تھام کرنی ہے تو اس کے لئے مناسب طریقہ کار اپنانا ہوگا۔ یہ کام اس کے بقول ''بچوں کو گرفتار کرنے سے نہیں بلکہ بنیاد کو جڑ سے اکھاڑنے سے ہوگا: یعنی ایک ناکام ریاست جس میں کسی حکومت، اسکول، یا ملازمتوں کا وجود نہیں ہے، اصل مسئلے کی جڑ ہے''۔

یہ بہت دلیرانہ منصوبہ ہے۔ مگر میرے احساس کے مطابق یہ پنجہ جیسے لوگ ہی ہیں جو اس کے راستے میں حائل ہیں۔ جب میں نے اس سے سوال کیا کہ آیا وہ خوش ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ ''میں خوش ہوں، میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے جب کسی عورت کی طلب ہوتی ہے تو اسے پیسے دیتا ہوں اور وہ میری داشتہ بن جاتی ہے۔ جب مجھے کسی بحری جہاز کی ضرورت ہوتی ہے تو میں باہر نکلتا ہوں اور جہاز میرے قبضے میں ہوتا ہے۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ سمندر اتنا وسیع ہے جتنا کہ صومالیہ۔ صومالیہ کو کوئی کنٹرول نہیں کرسکتا۔ اور سمندر پر بھی کسی کا کنٹرول نہیں ہے۔'' قزاقی کو ختم کرنے کے لئے مستقبل کے صومالیہ کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پنجہ اور اس کی طرح کے بے شمار لوگ پہلے ہی سے اپنے اپنے لبرتالیا میں رہ رہے ہیں۔

ایک امارت کی تکمیل کا سفر

مائیکل شومن۔ دبئ

دبئ کی سیر کر کے آنے والی کسی بھی سیاح کو یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوگی کہ کسی چالاک پراپرٹی ڈویلپر نے ایک پوری کی پوری مال یا مارکیٹ عظیم سیاح ابنِ بطوطہ کے نام وقف کر دی ہے۔ اس کی راہداریوں میں ایچ اینڈ ایم شاپس یا فوڈ کورٹس کی دلکش قطار نظر آسکتی ہے نیو جرسی کے کسی بھی وسیع مال سے مشابہہ، تاہم عمارت کا نقشہ ابن بطوطہ کی مشہور تاریخی سیاحتوں کے جذبے کو دوبارہ زندہ کرتا نظر آتا ہے یا کچھ اسی طرح کا نظریہ اس کی انتظامیہ پیش کرتی ہے۔ چائنہ ہال میں چوکور بادبان والی چینی کشتی کا جیتا جاگتا نمونہ ملٹی پلیکس (Multiplex) کے باہر پانی کی دھاریں نکالتے ہوئے فوارے کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ انڈیا والے حصے مین ایک پر تکلف انداز میں سجا ہوا مصنوعی ہاتھی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک نمائش میں سیاح کے کارناموں کے حوالے سے لوگوں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ ماہرین پر مشتمل مختلف کمیٹیاں اس کے سفر کے ساتھ ساتھ مختلف کارناموں وغیرہ کی تفصیلات بتا رہی ہیں، اور حساب سمجھانے والا ایک عدد فریم (Abacus) اور اس کے زمانے کا دوسرا ساز و سامان یا لوازمات پلاسٹک کے ڈبوں میں پڑے ہیں۔ وسط میں ایک عدد سٹار بکس (Starbucks) ہے۔ کیا ایک انتہائی مشہور سیاح کو خراج تحسین پیش کرنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ ہے؟

اصل میں یہ مناسب ہی لگتا ہے۔ مال اگر چہ بڑی بے ذوقی کا شاہکار لگتی ہے مگر یہ

اسلامی دنیا کی معاشی عظمت کی بحالی کی امنگ یا جستجو کی ایک علامت بھی ہے۔ سٹار بکس پر نمائش کردہ اشیاء ہمیں سرزمین عرب کے اس دور کے خزانوں کی یاد دلاتی ہیں جب ابن بطوطہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس سیاح کی وفات کے ایک سو سال بعد، تاہم، مسلمانوں کی معاشی طاقت کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یورپ عالمی معیشت پر چھا گیا اور اسلامی دنیا اس خلاء کو کبھی پورا نہ کر سکی۔

عرب قوم پرست اپنے خطے کی پسماندگی کا ذمہ دار یورپی نو آدیاتی نظام کو ٹھہرانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے، تاہم یہ معاشی زوال کی علامت ہے نہ کہ وجہ۔ دوسرے تجزیہ نگار اسلام میں سود کی ممانعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو کہ ان کے مطابق جدید مالیاتی نظام کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت محمد ﷺ ایک تاجر تھے اور انہوں نے اپنے دین یا عقیدے کے روحانی مرکز کے طور پر مکہ کا انتخاب کیا جو کہ تجارتی قافلوں کی آماجگاہ ہونے کی بنا پر ایک دولت مند شہر تھا۔ صدیوں تک اسلامی ممالک اقتصادی طور پر ہر لحاظ سے اتنے ہی ترقی یافتہ رہے جیسا کہ عیسائی یورپ۔

اپنی نئی کتاب ''دی لانگ ڈائی ورجنسی'' میں ماہر اقتصادیات تیمور کرن دلیل دیتا ہے کہ اسلامی قانون کو ذمہ وار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کاروباری شراکت اور وراثت کے قانون کے حوالے سے اس کی سخت شرائط کی بناء پر اسلامی دنیا کے لئے مغرب میں پروان چڑھنے والے سرمایہ دارانہ اداروں کے ساتھ مقابلہ مشکل ہو گیا۔ جس طرح یوروپی ممالک نے جائنٹ سٹاک کمپنیوں اور جدید بینکاری کے جال کی مدد سے عالمی معیشت کو مخصوص شکل عطا کی، اسلامی دنیا نے اس طرح نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ دبئی بہت دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ بہت سے پہلوؤں سے امارت جاندار، عالمگیر تجارتی مال کی درآمد برآمد اور تقسیم کاری کے ایسے مراکز کی تخلیق نو کی کوشش ہے جو کسی زمانے میں مشرق وسطیٰ کی معیشت کا جزو لازم شمار ہوتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب ایسے اداروں کو متعارف کرانا ہے جو جدید معیشت کو چلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ 2000 میں دبئی نے سٹاک مارکیٹ کا آغاز کیا۔ حکومت نے اسپیشل اکنامک زونز (SE2s) کا آغاز کیا ہے جس میں بیرونی سرمایہ کار آسانی سے کاروبار شروع کر سکنے کے علاوہ اعلیٰ معیار کے ہوائی اڈے اور بڑی شاہرائیں تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہر چیز کے پس پشت غیر ملکی مذہبی اور ثقافتی روایات کے

لئے برداشت اور کشادہ دلی جیسا مضبوط عنصر کارفرما ہے جس کی بنا پر ہر رنگ اور نسل کے لوگوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ پیرا کی کا لباس پہنے ابن بطوطہ مال سے نکلتی ہوئی طویل قامت سنہرے بالوں والی حسینائیں اس صورتحال کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ قانونی مشورے دینے والی فرم وِنسن اینڈ یلکنز میں شرکت کار ایمان خالق کے مطابق ''دوبئی میں اس طرح کے ادارے اور قواعد وضوابط موجود ہیں جن کی بنا پر یہ فرینکفرٹ یا سنگاپور سے بہت قریبی مقابلے میں آ گیا ہے''۔

چنانچہ اس صورتحال کے نتیجے میں دبئی علاقے کا بنیادی تجارتی و مالیاتی مرکز بن چکا ہے۔ ریت کے ٹیلوں میں سے جدید و بلند و بالا عمارتوں کا ایک جنگل بر آمد ہو چکا ہے جس میں 163 منزلہ برج خلیفہ بھی شامل ہے جو کہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ جدید طرز کا کیپٹل کلب پوری دنیا سے آنے والے خوش لباس بینکاروں اور نجی حصص (Private - equit) کے ماہرین کی سرگرمیوں سے گونج رہا ہے۔ ابن بطوطہ مال کی راہداریاں مختلف زبانوں، جلد کی رنگتوں اور طرح طرح کی وضع کے لباسوں کا مرقع بن چکی ہیں۔

تاہم، ان کامیابیوں کے باوجود دبئی میں تبدیلیوں کا عمل ابھی تکمیل کے مراحل سے بہت دور ہے۔ 2009 میں یہ حیران کن انکشاف کہ سرکاری ملکیت کا ادارہ دبئی ورلڈ (جس کے ایک ذیلی تعمیراتی شعبے نے ابن بطوطہ مال تیار کیا ہے) اپنا واجب الادا قرض واپس کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ امارات کاروباری اور مالیاتی نظام خطرناک حد تک غیر شفاف ہے۔ اس کے نتیجے میں جائیداد کی قیمتوں میں تیزی سے اتار چڑھاؤ دیکھنے میں آیا جس کی بناء پر معیشت سست روی کا شکار ہونے کے ساتھ ہی دیوالیہ پن کے نئے قوانین بھی آزمائش سے دو چار ہیں۔ اسپیشل اکنامک زونز بھی دبئی کے حکمرانوں کے لحاتی یا غیر سنجیدہ فیصلے کی پیداوار ہیں، یعنی یہ ایسے احکامات کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں جنہیں کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ معیشت کا انتظام قریبی رشتوں میں منسلک مقامی عرب باشندوں کے ہاتھ میں ہے اور ان میں سے ہر ایک شہر کے بینکوں کاروباری کمپنیوں، اور حکومتی اداروں میں ایک سے زائد عہدوں پر فائز ہے۔ تاہم دبئی انٹرنیشنل فنانشل سنٹر کے گورنر، احمد حمید الطیار کے مطابق دبئی کے حکمران یہ عہد کئے ہوئے ہیں کہ ایک صحت مند معیشت کے لئے شہر کے اداروں کو مستحکم کر کے

رہیں گے۔اس کے بیان کے مطابق ''بحران کے بعد حکومت صاف شفاف انتظامی معاملات پر توجہ دے رہی ہے۔''

ابن بطوطہ مال پر مختلف نظریات اور ثقافتوں کا باہمی ملاپ ایک طرح کا سراب نظر ہی لگتا ہے۔دبئی کے معاشرے کا حقیقی رخ تاریک ہے: متمول اور با اثر لوگوں کا مقامی طبقہ بیرونی ممالک سے آنے والے ان محنت کشوں کی دن رات کی مشقتوں کے طفیل عیاشی کی زندگی گزار رہا ہے۔مقامی افراد بیس لاکھ پر مشتمل کی آبادی کا غالباً دسواں حصہ ہیں، مگر حکومت انہی لوگوں کی ہے اور انہیں ہر طرح کی خصوصی سہولیات مثلاً حکومت کی طرف سے بجلی اور پانی کی انتہائی سستے داموں فراہمی اور صحت کی مفت فراہمی جیسی سہولیات حاصل ہیں۔سپیشل اکنامک زونز سے باہر قائم کردہ ہر کمپنی کے لئے مقامی شراکت کار بمعہ اکثریتی حصص کی شرط ضروری ہے۔اس کے علاوہ باقی ماندہ غیر ملکی افراد ملک میں اس وقت تک قیام کر سکتے ہیں جب تک ان کے ملازمتی اجازت ناموں کی میعاد باقی ہے۔لہذا اکثریت کی زندگی بھارت نتانے کی طرح ہے جو اپنے گھر کو گھر نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھارتی نژاد ڈاکٹر 1990 میں دبئی آیا تھا اور اگرچہ اب وہ کہیں اور رہنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا مگر اسے خدشہ ہے کہ یہاں کئی عشروں کے بعد بھی سب حاصل کردہ بے کار جا سکتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ''میں نے اپنی نوجوانی اس جگہ کی ترقی کے لئے وقف کر دی ہے''۔ ''اور اگر 70 برس کی عمر میں مجھے واپس اپنے ملک لوٹنے کے احکامات صادر کر دیئے جائیں تو میں کہاں جاؤں گا؟''

سچ تو یہ ہے کہ دبئی کی ترقی بتانے جیسے لوگوں کی مرہون منت ہے۔دبئی کی کامیابی یا ترقی کی داستان کا عرب یا اسلامی نظریات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔زیادہ تر سرگرمیاں اسلامی قوانین کے دائرے سے باہر ہی رہتی ہیں: زیادہ تر کاروباری سرگرمیاں مغربی قانون کے اصولوں کے مطابق ہیں۔دبئی ایسی اسلامی معیشت کی مثال نہیں ہے جو مغرب کے مقابلے پر آ رہی ہے۔یہ ایک ایسے مسلمان ملک کی مثال ہے جو مغرب کے اقتصادی اصولوں کی پیروی کر کے ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

کیا دبئی یہ کامیابی صرف اسلام کے سہارے حاصل کر سکتا ہے؟ ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ایسا کوئی نمونہ نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ ایک ایسی معیشت جو صرف اسلامی اصولوں کی بنیاد پر استوار کی جائے جدید دنیا میں پھل پھول سکتی ہے۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کا

مالیاتی نظام بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور دن بدن پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض تبصرہ نگاروں کے مطابق اسلامی قوانین کی سخت گیر حدود اس عالمی معیشت کے لئے اکسیر ثابت ہوں گی جو مالیاتی بے اعتدالیوں کے سبب مشکلات کا شکار ہے۔ مورگن سٹینلے انوسٹمنٹ بنک میں اسلامی مالیات کے ماہر یاور معینی کی رائے میں ''اسلامی مالیات کے ایک بنیادی اصول کے مطابق: افواہوں یا قیاس آرائیوں کی بنیاد پر کوئی سرمایہ کاری نہ کریں۔'' تاہم اس امر کی تصدیق کرنے کا عمل کہ آیا کوئی سرمایہ کاری اسلامی عقائد کے مطابق ہے یا نہیں لاگت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ جائیداد کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے والا اپنی عمارت کا کوئی حصہ شراب یا سور کا گوشت فروخت کرنے کے کاروبار کرنے والوں کو کرایہ پر نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی قرضے کی سخت شرائط حصص پر سرمایہ کاری کو اور بھی زیادہ مشکل بنا دیتی ہیں بہ نسبت مغربی طرز کے لین دین کے اور یوں خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

ان سب عوامل کے باوجود، دبئی کی مثال سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست عالمی معیشت کے نظام سے ہم آہنگی کر کے اس کے اندر رہتے ہوئے اس کے ساتھ مسابقت کی تدابیر کے ذریعے ابن بطوطہ دور کی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکتی ہے۔ اگر ابن بطوطہ آج کے دبئی سے گزر رہا ہوتا تو شاید اپنے چھوڑے ہوئے ثقافتی ورثے سے منسوب شاپنگ مال کو دیکھ کر غالباً حیران و ششدر رہ جاتا، اور سٹاربکس میں بھی نشست سنبھال لیتا۔ مگر وہ جاوا چپ فراپکینو کا کیا کرتا؟

☆☆☆☆☆

رومان کے تعاقب میں

ایرین بیکر۔ ریاض

جمعرات کے دن آدھی رات ہونے میں دس منٹ باقی ہیں۔ سعودی عرب میں ہفتے کے اختتام کا آغاز ہوا چاہتا ہے اور اگرچہ آخری لمحات کا وسط آ پہنچا ہے مگر طلحہ سٹریٹ میں پورشے (Porsches) اور فیراری (Ferraris) کار میں بیٹھے ہوئے بچوں کا رش لگا ہوا ہے۔ جو تفریح کے موڈ میں ہیں۔ کاروں کے شور مچاتے ہوئے ہارن کی مدھم کردہ آواز پر کھرج ساز (Bass) کی ارتعاش پیدا کرنے والی موسیقی غالب ہے۔ مقصد محض ٹریفک کے اندر جگہ بنا کر نکل جانا نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ گاڑیوں میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوانوں کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے۔ گاڑی کا اے سی تیز کر کے نیچے گرے ہوئے شیشوں والی کھڑکی میں سے بازو باہر کی طرف لٹکائے، اپنی قیمتی گھڑی کی نمائش کرتے ہوئے وہ اپنی چرمی شاہی نشستوں میں نیم دراز بیٹھے ہوئے ہیں۔ مور بھی اور شکاری بھی، دونوں ایسا پرسکون انداز اپنائے ہوئے ہیں جو کہ گزرتی ہوئی گاڑیوں میں شکار کے کسی نشان کی کھوج میں چوکسی نظروں کی نفی کرتی ہیں: ایک اکیلا ڈرائیور اگلی نشست پر براجمان اور پچھلی نشست پر سختی سے چڑھے ہوئے رنگین شیشوں کے پیچھے نیم مبہم عورت کی دھندلی شکل۔

میں اس سارے منظر کا جائزہ اپنی دوست کی ایس یو وی گاڑی کی پچھلی نشست پر

تاریک شیشوں کی قدرے گمنامی کے تحفظ میں بڑے آرام سے لیٹی ہوں۔ ایک قریبی کار کی ہنگامی دستک میری محویت کو توڑ دیتی ہے۔ ایک چمکدار سفید کرائسلر ساتھ آ کر رکتی ہے۔ اس کے اندر ایک نوجوان آدمی جس کے سر کے سرخ و سفید چار خانوں والے رومال کی کلف لگی اور تہہ کی ہوئی نوکیں اونچی (Stetson) کی طرح نیچے کی جانب اس انداز میں کھینچی ہوئی تھیں جو کہ شوقین مزاج لوگوں میں مقبول ہے، ہاتھ ہلا ہلا کر میری توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ مجھے دونوں انگوٹھوں سے پسندیدگی کا اشارہ اور ایک چوڑی مسکراہٹ دیتے ہوئے اپنے گھٹنوں سے کار چلانے کی کوشش میں بڑے متذبذب اور غیر یقینی سے انداز میں اپنا رخ موڑتا ہے۔ پھر وہ پلاسٹک کے غلاف والا دستی کارڈ اوپر اٹھاتا ہے جس پر فون نمبر کندہ کیا ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد جس دوران میں اس نمبر کا لکھ کر رکھ لیتی ہوں، وہ لائن کے اس پار سے چلّاتا ہے ''خلاؤں؟ کیا تم نے نمبر لے لیا؟'' ایک طرح سے معاہدے کو حتمی شکل دینے کے انداز میں وہ اپنے ہونٹوں پر ہولناک انداز میں زبان پھیرتا ہے، اپنی انگشت شہادت کو زبان کچھ زیادہ ہی باہر نکال کر بوسہ دیتا ہے اور مارلن منرو کی طرح میری سمت اچھال کر قہقہہ لگاتے آگے نکل جاتا ہے۔ یہ ہے جسم فروش عورت کے حصول کا سعودی طریقہ۔

سلمان کو ایک امریکی صحافی کا فون موصول ہونے پر یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ جب چند روز بعد ہم ایک مشہور کیفے میں ملاقات کرتے ہیں تو وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہتا کہ اس رات اس نے کم از کم ایسے دس فون وصول کئے اور اسے پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میری کار کونسی تھی۔ سدا کا کھلاڑی وہ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے مخصوص مقامی طرز کلام کے ساتھ ''بے تکلفی کا اظہار کیا'' کیونکہ میں ''بہت خوبصورت'' ہوں۔ جب میں نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا کہ رنگین شیشوں کے پیچھے کوئی دادی اماں بھی تو ہو سکتی تھی تو وہ کندھے اچکا دیتا ہے۔ ''میں لڑکیوں سے اور کس طرح مل سکتا ہوں؟''

ورجن ماجیٹو (مشروب) پیتے ہوئے سلمان مجھے ایک نایاب قسم کے رومانوی منظر کے بارے میں بتاتا ہے۔ سعودی عرب میں کوئی سینما گھر نہیں ہے نہ ہی کوئی شراب خانہ۔ شادی کی تقریبات مخلوط نہیں ہوتیں نہ ہی اسکولوں میں مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔ سعودی عرب میں، جہاں ثقافت اور مذہب مردوں اور عورتوں کے درمیان تمام غیر رسمی اور بے قاعدہ روابط روکنے پر زور دیتے ہیں،

نوجوان کنوارے رومان کے تعاقب میں انتہائی طریقے آزماتے ہیں۔

ریاض میں، سلمان بتاتا ہے، دوستی لگانے میں کافی مسابقت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ کھوج لگاتے ہوئے مردوں کو اکثر بڑی خوبصورت اور دلکش نمونے کی کاریں کرائے پر لینی پڑتی ہیں تاکہ ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں۔ ''لڑکیوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لڑکا خوبصورت یا خوش اخلاق ہے'' اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ صرف دولت مندوں کو اہمیت دیتی ہیں''۔ پانچ برس سے دوستیاں کرتے ہوئے سلمان بہت سی رومانی ملاقاتیں کر چکا ہے اور حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے لئے ایک گرل فرینڈ بھی رکھ چکا ہے۔ تاہم اب 24 برس کی عمر میں وہ ایک سنجیدہ تعلق کا خواہش مند ہے۔ ''یقیناً رومان'' وہ کہتا ہے۔ ''اگر مجھے کوئی خوش اخلاق اور معزز لڑکی مل گئی تو میں شادی کرنے سے بھی احتراز نہیں کروں گا۔''

دو مختلف دنیائیں

''(میں حاصل نہیں کر سکتا عدمِ) اطمینان'' یقیناً عرب بغاوتوں کے ساؤنڈ ٹریک پر نہیں تھا۔ مگر یہ بہتر طور پر ان کا نفس مضمون ہو سکتا تھا، یہ رائے مشرقِ وسطیٰ پر معروف محقق برنارڈ لیوس کی ہے، جس نے یروشلم پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ نکتہ پیش کیا تھا کہ بغاوتوں کے پس منظر میں جزوی طور پر جنسی گھٹن کا عنصر کارفرما ہے۔ ''مسلم دنیا میں مغربی انداز کا کبھی کبھار کا جنسی تعلق مفقود ہے۔'' بقول لیوس ''اگر کوئی نوجوان جنسی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے دو ہی امکانات ہوتے ہیں، شادی اور قحبہ خانہ۔ نوجوانوں کی ایک وسیع تعداد ایسی ہے جو شادی یا قحبہ خانہ دونوں کے لئے پیسوں کی استطاعت نہیں رکھتی جبکہ جنسی خواہش بہت شدت سے بڑھتی جاتی ہے۔ ایک طرف، گھٹن آپ کو خودکش بمبار بنا سکتی ہے۔ دوسری طرف نری گھٹن ہے۔''

اس تبصرے کے جواب میں بعض لوگوں نے بہت مسموم ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے جبکہ بعض نے ہلکے ہلکے اثبات میں سر ہلایا ہے۔ مصر کے ماہر جنسیات قطب کے مطابق یہ نظریہ کہ مرد شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے بالکل مضحکہ خیز ہے۔ نچلے طبقے میں کم عمری کی شادیوں کی شرح کا تقابل دولت مند طبقے میں شادیوں کی شرح سے کریں تو صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔ قطب کے مطابق دیر سے کی جانے والی شادیاں خود اپنی مرضی سے کی جاتی ہیں۔ تاہم انیس سالہ

یونیورسٹی طالب علم محمود تقی کا کہنا ہے کہ ملازمت کے بغیر اسے بمشکل ہی ایک اچھا جوڑ تصور کرے گا۔ ''ایک لڑکے کو ملازمت کے حصول کے لئے 30 برس کی عمر تک انتظار کرنا پڑ سکتا ہے، لہذا گھٹن کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ ہم بدعنوانی، ناانصافی اور بے روزگاری کے خلاف انتظار کر رہے تھے، مگر یقینی طور پر جنسی گھٹن کا عنصر بھی شامل تھا۔'' اس کا کہنا تھا کہ بعض مرد طوائفوں کے پاس جاتے ہیں مگر مذہبی رجحان رکھنے والے ایسا نہیں کرتے۔

یقیناً ایک انیس سالہ نوجوان شادی کی نسبت جنسی تسکین کی طرف زیادہ راغب ہوسکتا ہے۔ (ابن بطوطہ کے سر پر دونوں جنون سوار تھے: اس کے اندر جنسی جبلت بہت زیادہ تھی اور اس نے اپنے سفر کے دوران بے شمار شادیاں کیں)۔ تاہم مشرق وسطیٰ میں بہت سے لوگوں کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ شادی محض مذہبی طور پر جنسی تعلق کا اجازت نامہ نہیں ہے۔ یہ معاشرے میں ایک مقام حاصل کرنے کا طریقہ بھی ہے۔ طوائفیں اور انٹرنیٹ پر فحش مواد کسی حد تک گھٹن میں کمی کا باعث ہوتے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ احساس گناہ اور شرم کا احساس بھی ہوتا ہے۔ بقول قطب تاہم یہ ذہنی قربت اور سماجی پختگی پیدا نہیں کرسکتے۔ اگرچہ بہت سی شادیاں ابھی بھی والدین کی رضامندی سے ہوتی ہیں مگر کنوارے سعودی مرد سیٹلائیٹ اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہالی وڈ کے انداز کے رومان کی جھلکیوں سے بہت زیادہ مسحور ہوتے جا رہے ہیں۔

وہ جیسے ہی روایت اور جدید محبت کے درمیان گامزن ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو سعودی ثقافت کی رکاوٹیں ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ ایک اس طرح کی منفرد رومانی ملاقات کی صورت میں نکلتا ہے جو ربط ضبط کے مواقع کی ایک سنجیدہ کھوج بھی ہوتی ہے اور خطرے سے پر بھی۔ دونوں جنسوں کے درمیان علیحدگی کی شروعات کی بنیاد نہ صرف اسلام نے رکھی بلکہ یہ جزیرہ نما عرب کے بدو قبائل کی روایات کی عکاسی بھی کرتی ہیں جن کے مطابق عورت کو عوام کی نظروں سے بچا کر رکھنا عزت کی علامت ہوتا تھا اور جہیز کی تصدیق کا طریقہ دریافت ہونے سے قبل کے دور میں بچوں کے جائز ہونے کی ضمانت بھی تھا۔ یہ بدو ثقافت پورے جزیرہ نما میں پھیل چکی ہے اگرچہ بحیرہ احمر کے شہر جدہ میں جہاں کئی صوبوں سے قریبی شہر مکّہ میں آنے والے زائرین نے زیادہ آزادانہ اور عالمگیر روایت کے نشانات ثبت کر دیئے ہیں، یہ ثقافت نسبتاً کمزور پڑ چکی ہے۔ عورتیں اور مرد مکّہ میں ہمیشہ اکٹھے کھیلتے رہے ہیں، مگر قدامت پسند مذہبی

حلقوں کی دلیل ہے کہ ان سخت قوانین کا اطلاق جو اصل میں حضرت محمد ؐ کی ازواج مطہرات کے لئے تھے، تمام خواتین پر ہونا چاہئے۔

دوسرے لوگ عورتوں اور مردوں کے اختلاط پر پابندی کے جواز کے طور پر سماجی مسائل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ''ان ضوابط کی بناء پر معاشرہ اس ابتری سے محفوظ رہتا ہے جو مغرب میں عام نظر آتی ہے'': ناجائز بچے، اکیلی مائیں، اسقاط حمل اور یتیم خانوں کی کثرت''، یہ الفاظ خود کو اعتدال پسند مذہبی عالم قرار دینے والے شیخ عبداللہ الاویردی کے ہیں، جو اس نے ان حالیہ اعداد وشمار کے حوالے سے کہے جن کے مطابق امریکہ میں 40 فی صد حمل رشتہ از دواج کے بغیر ہوتے ہیں۔ اختلاط کے خلاف قوانین کا مطلب یہ ہے کہ کنواری عورتوں اور مردوں کے آزادنہ میل جول میں کمی۔ بہت سے دفاتر وغیرہ میں بھی عورتوں اور مردوں کے لئے علیحدہ حصے مختص ہیں، ماسوائے دواؤں کے شعبے کے جہاں دونوں کی علیحدگی کام کے معیار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اور اپنی طبی تعلیم کے اختتام کی تقریبات منانے والی بہت سی نوجوان خواتین کے بقول، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے لئے اس شعبے کا انتخاب کیا ہے۔ ''بالکل امریکہ کی طرح، کسی سے ملنے کی بہترین جگہ وہ ہے جہاں آپ کام کرتے ہیں'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''اور ہمارے لئے وہ جگہ ہسپتال ہے۔'' اس نے مجھ سے اپنا نام خفیہ رکھنے کی درخواست کی کیونکہ اسے شرم سی محسوس ہو رہی تھی کہ کہیں اسے مردوں میں دلچسپی رکھنے کی بنا پر بُرے کردار کی حامل نہ سمجھ لیا جائے۔ (سعودی عرب میں رومانی ملاقاتوں کا موضوع اتنا حساس ہے کہ بہت سے افراد نے مجھ سے گفتگو کے دوران یہ شرط عائد کی کہ وہ اس صورت میں رائے دیں گے اگر ان کے نام کا صرف پہلا حصہ یا پھر کسی نام کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔

لڑکیاں صرف اچھا وقت گزارنا چاہتی ہیں

سعودی عرب میں عورتیں بھی مردوں کی طرح کسی ساتھی کی تلاش میں نکلتی ہیں اور اس حوالے سے زیادہ سخت قوانین کی جکڑ سے بھی بچ نکلتی ہیں۔ اور اگر انہیں قوانین کی پابندی بھی کرنی پڑے تو وہ رسماً ہی ہوتی ہے۔ سعودی عرب میں خواتین کے لئے ضروری ہے کہ وہ سر کو ڈھانپ کر رکھیں اور جسم پر عبایا زیب تن کر لیں۔ ریاض میں کالی عباؤں کی بھرمار ہے۔ تاہم جو چیز فاصلے سے

ایک وردی کی طرح لگتی ہے وہ قریب سے باہمی رابطے کا ایک دلیرانہ اشارہ ثابت ہوسکتی ہے۔ آستینوں پر ایک رنگین پٹی، آرائش میں اضافے کے لئے سوار وسکی (Swaro Vski) کے بلوریں موتیوں کے ساتھ۔ ''یقیناً لڑکے ہماری عباؤں پر توجہ دیتے ہیں،'' 22 سالہ ماہا نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی بڑی نفاست سے بنی ہوئی شگاف دار آستین جن کے نیچے سے سفید ساٹن کا استر صاف نظر آتا ہے۔ یہ شاپنگ مال میں جمعہ کی ایک شام کا منظر ہے اور وہ پوری طرح بن سنور کر آنکھوں پر مصنوعی پلکیں لگا کر آئی ہوئی ہے۔ ''تمام لڑکیاں خوبصورت نظر آنا چاہتی ہیں۔ اور ہم باہر نکلنے سے قبل اپنی آرائش و زیبائش کا سامان کر کے نکلتی ہیں۔'' وہ گویا ہوتی ہے۔ اور اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی اپنے مرد دوست سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ اس کے طرف چل کر آیا اور اسے اپنا نمبر دیا۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ اگرچہ کسی مہذب خاندان سے نظر نہیں آتا تھا مگر خوبصورت تھا۔ ''دل لبھانے کے بین الاقوامی قوانین کا اطلاق ابھی تک ہوتا ہے: میں نے اسے ایک ہفتے کے بعد فون کیا تا کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں آسانی سے ہاتھ آنے والی ہوں''۔

دو ماہ کے لئے ''ان کی ملاقاتیں'' محض دو گھنٹوں کے لئے تقریباً ہر رات گپ شپ تک محدود رہیں۔ اب وہ کبھی کبھار رات کے کھانے پر اس کے گھر بھی چلی جاتی ہے جہاں اس کی ماں اور بڑی بہن ہمراہ جاتی ہیں کبھا کبھار وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں یا چپکے سے ایک دوسرے کا بوسہ لے لیتے ہیں۔ تاہم معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک لڑکے کو فرانسیسی انداز میں بوسہ دیا تھا مگر اس نے اعتراف کیا کہ اب اپنے موجودہ دوست کے ساتھ کبھی ایسا نہیں کرے گی۔ ''یہ مناسب نہیں رہے گا کیونکہ وہ ایک ایسا آدمی ہے، جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے''۔

جب ایک مرتبہ فون نمبروں کے تبادلے اور ٹیلی فونک گپ شپ کا مرحلہ گزر جاتا ہے تو جوڑے کے لئے سب سے بڑی آزمائش ملاقاتوں کے لئے مناسب جگہوں کی تلاش ہوتی ہے۔ غیر شادی شدہ جوڑوں کو سر عام میل جول کی اجازت نہیں ہوتی؛ اگر پکڑے جائیں تو انہیں جرمانے کے ساتھ ہی قید کی سزا بھی ہوسکتی ہے۔ ایک عورت کے لئے یہ سب باپ کی عزت خراب کرنے کا باعث اور اس کے کردار پر داغ ثابت ہوسکتا ہے۔ پکڑے جانے کا خوف ایک خوشگوار تجربے کو ذہنی دباؤ کی کیفیت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ متاوین یا مذہبی قوانین پر عمل کرانے والی پولیس کا نام ہی

رونگٹے کھرے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ خدا کے لئے ان کا نام ہی نہ لیں، ایک عورت فکر مند انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کہیں وہ آ ہی نہ جائیں''۔ ابھی چند ہفتے قبل وہ اور اس کا مرد ساتھ ایک آڑ کے پیچھے اس وقت کئی گھنٹے خوفزدہ حالت میں کھڑے رہے جب متاوین کی طرح نظر آنے والی پولیس ایک ایسے ریستوراں میں گھس گئی جو نوجوان جوڑوں کی ملاقات کے لئے معروف تھا۔

بائیوانجینئرنگ کے ایک نرم مزاج اور پرتپاک طالب علم یوسف کے مطابق جو کہ کئی برسوں سے اس میدان کا کامیاب تجربہ رکھتا ہے، ملاقات کے لئے ناشتے کے اوقات میں نکلنا بہت بہتر رہتا ہے کیونکہ اس وقت ''داڑھی والوں'' کا ادھر ادھر سے نمودار ہو جانے کا امکان کم ہوتا ہے۔ ایک اور ترکیب، اس کے مطابق یہ بھی ہے کہ کسی ایسے مال یا پلازے میں ملاقات کی جائے جس کے مالک نے متاوین سے عدم مداخلت کا کوئی خاموش معاہدہ کیا ہوا ہو۔ یوسف کی پسندیدہ جگہ ریاض کا شاندار تزئین و آرائش کا حامل کنگڈم ٹاور ہے جہاں پر نصب فضائی پل سے شہر کا انتہائی دلکش منظر دکھائی دیتا ہے، جس کے ساتھ ایک اضافی فائدہ بھی ہے۔ اگر آپ خوش قسمت ہیں تو وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے چکر آ رہے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ لگ جاتی ہے، وہ دانت نکوس کر کہتا ہے۔ بعض اوقات ملاقات کی کوشش لطف آمیز ہو جاتی ہے۔ منال کو، جس نے اپنے مرد ساتھی سے دو برس قبل شادی کر لی تھی، اب اس ساری صورتحال میں کوئی ڈرامائی کشش نظر نہیں آتی۔ وہ کہتی ہے کہ ہماری ملاقاتیں اس لئے بور ہو چکی ہیں کیونکہ ہم شادی شدہ ہیں'' وہ ہنستی ہے۔

یقیناً ساری ملاقاتوں کا نتیجہ شادی کی صورت میں نہیں نکلتا۔ یوسف کے اعتراف کے مطابق ''آپ ہمیشہ ایک مناسب ساتھ پالینے کی امید لئے ہوتے ہیں'' مگر ''آپ زیادہ تر پرلطف لمحات گزارنا چاہتے ہیں''۔ اس کے علاوہ، اس کے بقول جب وقت آئے گا تو اس کے والدین اس کے لئے مناسب بیوی کا انتخاب کر لیں گے۔ ''خاندان کو اپنی بیٹیوں کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر وہ لڑکوں سے دل لگی کرتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ غالباً شادی کے لئے مناسب لڑکیاں نہیں ہیں''۔

آپ کی ساکھ اہمیت رکھتی ہے

آج کا سعودی عرب ایک ایسا ملک ہے جسے جین آسٹن باآسانی پہچان لیتی ہے۔

شادی کا مقصد جتنا یہ ہوتا ہے کہ کسی اچھے شریک زندگی کا انتخاب کیا جائے، اتنا ہی اس کا مقصد خاندانوں کے ملاپ پر زور دینا ہوتا ہے۔ ایک نوجوان دلہن سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ اس کی شہرت بے داغ ہو: کسی لڑکے کے ساتھ سرعام گھومتے پھرتے رہنے سے اس کے لئے کسی اچھے لڑکے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں کسی لڑکی کے باکرہ ہونے کے حوالے سے بہت زور دیا جاتا تھا، مگر آج کے دور میں جبکہ بیروت یا یورپ کا ایک دورہ کر کے اس کی بکارت کو مصنوعی طریقے سے بحال کیا جا سکتا ہے، ساکھ کی اہمیت زیادہ ہو گئی ہے۔ امکانی سسروال والے ایک لڑکی کے موبائل فون کا ریکارڈ طلب کر سکتے ہیں تاکہ اس کے ماضی کے تعلقات کے حوالے سے تحقیق کی جا سکے۔ اس لئے زیادہ دولت مند سعودی باشندے اپنے والدین کی اجازت سے ملاقاتوں کے لئے بیرونی ممالک کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ جوق در جوق بیروت، پیرس یا لنڈن جاتے ہیں جہاں وہ کسی خوف یا اپنے ملک میں ساکھ خراب ہونے کے خطرے سے بے نیاز دوسرے اہل سعودیوں سے بھی مل سکتے ہیں۔

جنسی تعلقات بھی، اگرچہ اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، قائم ہو جاتے ہیں۔ شادی کے بغیر جنسی تعلق ایک طرح سے شجر ممنوعہ سے کم نہیں، اس لئے بہت کم کنوارے ایسے ہوتے ہیں جو مانع حمل تکنیکوں تک رسائی رکھتے ہیں، اگر کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اس کے گھر والے شادی پر زور ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ خفیہ رومانی تعلقات کی ایک اور خامی بقول ایک سعودی ماہر نفسیات کے یہ ہے کہ جوان لڑکیوں کو یہ نہیں سکھایا جاتا کہ "ناں" کس طرح کرنی ہے۔ چنانچہ وہ بڑی آسانی سے عصمت دری کا شکار ہو بیٹھتی ہے۔ اور یوں اسے "اپنی عصمت کھو بیٹھنے" کے احساس جرم کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ اب کیا ہوگا، اور مجھ سے کون شادی کرے گا۔ نفسیاتی ہیجان خوفناک شکل اختیار کر جاتا ہے۔

عورتوں اور مردوں کے ملاپ پر سخت پابندیوں کا اکثر اوقات نتیجہ ہم جنس پرستی کی صورت میں نکلتا ہے، ایک یونیورسٹی طالب علم نے رائے دی۔ فحش فلموں اور فحش مواد کی طرح، بعض لوگوں کے لئے یہ زنا یا ناجائز تعلقات جیسے گناہ کبیرہ سے بچنے کا قابل قبول مذہبی طریقہ ہے، خاص طور پر نوجوان عورتوں کے درمیان۔ اور دی کے مطابق "سب سے قیمتی چیز ایک عورت کی بکارت ہے"۔ اگر اس کے کسی اور عورت کے ساتھ تعلقات ہیں تو اس سے اتنا فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ عارضی صورتحال ہوتی ہے۔

سعودی نوجوان مرد کسی معقول ملازمت کے ملنے تک اپنی شادی کو موخر کیے رکھتے ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بیروزگاری کی شرح گیارہ فی صد ہونے کے باعث اس کا حصول اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک سعودی نشری مبلغ (Televangelist) احمد الشیز ی کے مطابق، جو کہ زیادہ تر نوجوانوں کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے، اس طرح کی سوچ، عصمت و پاکیزگی پر زور دینے والی حیاتیات اور ثقافت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ، ہر جگہ، جنسی تسکین کا مسئلہ ہی ہے۔ مگر امریکہ کے برعکس، جہاں اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا، سعودی عرب میں ''معاشرہ اور مذہب شادی سے پہلے اس کی اجازت نہیں دیتا''، جو کہ آج کے زمانے کے حساب سے 30 برس تک موخر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہم 14 سے لے کر 30 برس تک کے درمیانی عرصے میں کیا ہونے کی توقع کر سکتے ہیں؟ یہ ایک ایسا بم ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے، اور مولوی حضرات صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ صبر اور ضبط سے کام لو۔'' اس کی رائے میں بہتر یہی ہوگا کہ شادی کی عمر کو جسمانی تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے گھٹا دیا جائے۔ میرے مستقبل کے دوست، سلمان کے مطابق، رومانی ملاقاتیں، خواہ ان کا انجام گال چومنے کی صورت میں ہی کیوں نہ نکلے، ایک طرح سے دباؤ کم کرنے والی کل کی طرح ہوتی ہیں۔ جب وہ رات کے وقت باہر نمبروں کے تبادلے بعد فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہا ہوتا ہے تو وہ جنسی تسکین کے بارے میں کم اور اس نشہ آور جذبے کے بارے میں زیادہ سوچ رہا ہوتا ہے جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر لڑکیوں کو ملنے کے مزید یا زیادہ فطری طریقے موجود ہوتے تو وہ اور اس کے دوست اس طرح کے جارحانہ طرز عمل کی طرف قدر مائل نہ ہوتے۔ وہ بڑے حسرتناک انداز میں جدّہ کا ذکر کرتا ہے، جہاں پابندیاں ذرا کم ہیں۔ ''جدّہ میں آپ کسی بھی لڑکی سے کیفے میں یا ساحل سمندر پر مل سکتے ہیں'' وہ تبصرہ کرتا ہے، ''وہاں تو یہ ایک معمول سمجھا جاتا ہے''۔

سعودی معیار سے جدّہ، یقیناً کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر معمول کے مطابق''، نہیں۔ وہاں بے شمار ساحلی آبادیوں میں جو کہ سمندر کے کنارے کنارے قطار بناتی چلی جاتی ہیں سعودی عرب کے ''مخملیں طبقے'' کے مرد اور عورتیں، یعنی اوپر کے طبقے میں شامل ہوتا ہوا متحرک دانش ور طبقہ، ساحل پر والی بال کھیلنے کے علاوہ بعد از غروب آفتاب ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تاہم ایک نوجوان والی بال کھلاڑی کے بقول مردوں اور عورتوں کو جدّہ میں نسبتاً زیادہ

آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محبت ان کی رسائی میں آ گئی ہے۔28 سالہ روآ کے مطابق، جو کہ خود اپنی پروموشنز کمپنی چلاتی ہے،''میں اس عمر میں بھی شادی کے لئے پریشان ہوں''۔مگر میں محبت کی شادی کرنا چاہتی ہوں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے''۔ یہ سعودی عرب میں بھی اور باقی تمام جگہوں مین بھی ایک ناقابل تردید سچائی ہے۔

وقت کی ریت اور پانی

اشان تھرور

فروری1352میں ابن بطوطہ اونٹوں کے قافلے کے ساتھ صحارا کے کنارے واقع سجلما سا کے شہر سے جنوب کی جانب دور دراز کے ممالک کی طرف روانہ ہوا۔ صحرا کے دوسری طرف کا یہ سفر نمک کے ویرانوں اور ''بدروحوں کے ٹھکانوں والے علاقوں سے گزرنے والے مراحل پر مشتمل صعوبتوں سے بھر پور دو ماہ کا جان گسل سفر تھا، مگر اس کے باوجود یہ بہت سے قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ تجارتی سامان اور اسلام کا یہ مطلب تھا کہ صحارا ایک دوراہا یا چوراہا تھا نہ کہ ریت کے ٹیلوں کا گمنام خطہ۔ مالے کی سلطنت میں اس نے جس شہر کا دورہ بھی کیا، وہاں پر اس آدمی نے تونبیاں (کدو کی طرح کی پھل) اور کھیرے پیش کیے جس نے حج کیا ہوا تھا۔ دریائے نائجر یا کو دیکھ کر ابن بطوطہ نے غلطی سے اسے دریائے نیل سمجھ لیا۔ اسے ایک مگر مچھ ''محض ایک چھوٹی سی کشتی کی طرح'' لگا۔ ٹائم کے فوٹو گرافر ڈومینیک ناہر نے افریقی صحرائے اعظم کے جنوبی علاقوں میں ابن بطوطہ کے راستوں کی پیروی کا بیڑہ اٹھایا۔ سیاحوں کے معروف شہر فیض سے شروع کرتے ہوئے وہ سجلما سا گیا، جس کے آثا، بقول ناہر''فراموش کردہ محسوس ہوتے ہیں''۔ صحرا سے ہوتے ہوئے مالی کی طرف ناہر ایک قدیم کچے شہر جینے(Djenne) کے پاس سے گزرا جو ابھی تک ویسا کا ویسا ہی ہے جیسا کہ ابن بطوطہ کے زمانے میں تھا۔ دریائے نائیجریا کے کنارے

ناہر نے ایک قدیم میلے یا جشن کی روایت کا نظارہ کیا، جس میں مچھیرے اپنے جال بڑی بڑی تعداد میں دریا میں ڈال رہے تھے۔ ناہر کے مطابق: میں جب پانی میں اترا تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔'' ابن بطوطہ کے بھی ہی احساسات ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

ایک نئی گریٹ گیم

حنا بیچ۔اتی راؤ

مشرق اور مغرب کے ملاپ کے مقام پر دریائے اُرل کے دہانے پر ایک ایسا شہر موجود ہے جو کہ یوریشیا کی سرزمین کو دو براعظموں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اتی راؤ جدید دور کے قزاقستان میں پہلی روسی بستی تھی؛ یہ ایک ایسا قلعہ تھا جو سائبیریا کے وسیع علاقوں میں آباد خانہ بدوشوں اور کوسک حملہ آوروں کے خطرے کی زد میں رہتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود یہاں جدید سیاحوں کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی؛ نہ مسحور کن تاریخی مقامات نہ کوئی غیر معمولی دلکش قدرتی مناظر، نہ کوئی انوکھی ثقافتی روایات۔ حتیٰ کے نزدیکی بحیرہ کاسپین بھی کسی طرح کی تسکین کا سامان فراہم کرنے سے قاصر ہے، میلوں تک پھیلے ہوئے کھاری پانی والے دلدلی قطعات، جو کہ مچھروں کی پرورش کی بہترین آماجگاہ ہیں جن کی دن کے وقت بھی بھرمار ہوتی ہے۔ شہر کے نواح میں گھومتے ہوئے، جہاں کبھی ابن بطوطہ نے سرائے چک کے گولڈن ہورڈ نامی نخلستان میں اپنے گھوڑوں کے بدلے اونٹ خریدے تھے، میری آنکھیں نمک کے دھبوں والے جھاڑی دار جنگلات کے یکسانیت کو توڑ کر رکھ دینے والی کسی نئی دریافت کی متلاشی تھیں۔ مگر سرائے چک کے آثاروں میں مٹی کی اینٹوں کی کچھ ڈھیریوں اور دریائے اُرل کے کنارے پر پڑی ہوئی انسانی کھوپڑی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔

یہ جگہ چونکہ ویران وغیر آباد ہے، اس لئے اتی راؤ جانے والی پروازیں ہمیشہ بھری ہوئی

ہوتی ہیں۔ سامان وصولی والی جگہ پر مچھیروں کے غول در غول مارنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ساتھ مضبوط عضلات والے فلپائنی سورج میں جلد کو سنولانے والے ہیوسٹن کے افسر اعلیٰ، انتہائی پر سکون انڈین باشندے اور خوشبو لگائے اور عمدہ جوتے اور گھڑیاں پہنے روسی کھڑے ہیں۔ اتی راؤ یوریشیا کے بنجر زلزلہ مرکز کی طرح دکھائی دیتا ہے، مگر یہ ایک نوجوان اور وسائل سے بھرپور قوم کا تیل کا روز افزوں ترقی کرتا کاروباری مرکز بھی ہے۔ تیل کی فزوں تر آمدنی کی بدولت شہر کے سب سے بڑے مگر بے کیف قسم کے ہوٹل میں جس کی دیواریں پتلی ہیں اور بالغوں کے لئے ٹی وی پروگراموں کی بھرمار ہے، کمروں کے کرائے ٹوکیو یا لندن کے برابر ہیں۔ شور مچاتی ہوئی لڈااس اور سکوڈا گاڑیوں کے درمیان مرسیڈیز بینز اور لینڈ کروزر بھی خرام افتاری سے چلتی نظر آتی ہیں۔ کریم رنگ کے کیلیفورنیا کی طرف کے بنگلوں کی چار دیواری کے اندر قطاریں، جن میں سے ہر ایک میں گھاس کا ایک قطعہ، ایک عدد ویبر کی جالی اور امریکہ کا بنا ہوا کوڑے دان موجود ہے تیل کے ان بڑے بڑے غیر ملکی تاجروں کی پناہ گاہ ہیں جو اتی راؤ سی طرز تعمیر سے ذرّہ بھر متاثر نظر نہیں آتے۔ اگرچہ اتی راؤ کا سپین اپنے نگ ماہی انڈوں کے لئے شہرت رکھتا ہے، مگر کھانے پینے کا ذوق وفن ایک اور شکل میں یہاں پہنچا ہے: ایک ٹی بی آئی فرائیڈے اور ایک باسکن رابنز۔

یہ نئے وسطی ایشیا کی مخصوص علامات (to tems) وسیع اور ممنوعہ سرزمین پر غالب تھا۔ مگر جب ابن بطوطہ (اور اس سے قبل پیدا ہونے والے مارکو پولو) کا یہاں سے گزر ہوا تو اس وقت یہاں کوئی ایک بادشاہت قائم نہیں تھی۔ آخر کار یہاں روسیوں کا غلبہ قائم ہو گیا۔ 1920 کی دہائی تک ملحد سوویت یونین پورے کے پورے وسطیٰ ایشیا کو نگل چکا تھا۔ حتیٰ کہ سوویت یونین کے ٹکڑے ہونے کے بعد بھی یہاں ماسکو کا اثر ورسوخ قائم رہا، کیونکہ خشکی میں گھرے اس خطے کا انحصار روس کے ساتھ تجارتی تعلقات پر تھا۔ چنانچہ امریکہ کی اس زمانے سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ قازقستان کے توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری کر کے روسی اثر ورسوخ میں کمی لائی جائے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں امریکہ اور قازقستان کے موجودہ حکمران سلطان نذر بائیوف کے مابین تعلقات سرد جنگ کے انداز کی موقع پرستانہ دوستی میں تبدیل ہو چکے ہیں، اگرچہ قازقستان کے اس آہنی حکمران کو امریکہ کے جمہوری اقدار سے متعلق لیکچروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

چین کی مداخلت بھی واضح ہونے لگی ہے ترقی پذیر دنیا میں جہاں کہیں تیل کے چشمے

ابلنے لگتے ہیں، چین کی عادت ہے کہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اپنے بے شمار اقتصادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے درکار توانائی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے چین نے ابھی تک زیر زمین موجود تیل و معدنیات کے عالمی ذخائر کی تلاش میں دنیا کا چپّہ چپّہ چھان مارا ہے۔ قازقستان اس وقت دنیا میں یورینیم کی سب سے زیادہ پیداوار کرنے والا ملک ہے اور ملک کے مغرب میں تیل کی حالیہ دریافتیں دو عشروں کے دوران دنیا کے دریافت کردہ وسیع ترین ذخائر میں شمار ہوتی ہیں۔ مڈل کنگڈم کی طاقت میں 2009 کے بعد اس وقت اضافہ ہونا شروع ہوا جب عالمی مالیاتی بحران نے مغرب میں عارضی طور پر سرمائے کی قلت کا شکار ہو جانے والی کاروباری اداروں کو چین کے سرمائے کی فراوانی رکھنے والے اداروں سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ صرف اسی سال چین نے قازقستان پر 10 ارب ڈالر کے حجم کی سرمایہ کاری نچھاور کرتے ہوئے وہاں سڑکوں کی تعمیر، ریلوے اور مواصلاتی روابط کی بحالی میں مدد دی۔

رواں موسم بہار میں چائنہ پٹرولیم اینڈ کیمیکل کارپوریشن یا سائنو پیک (Sino ped) نے ات راؤ آئل ریفائنری کے ایک ارب ڈالر توسیع کے منصوبے پر کام شروع کیا ہے۔ چینی کاروباری ادارے اب قازقستان میں تیل کی ایک چوتھائی پیداوار لائن کی وساطت سے چین پہنچا رہے ہیں جو بیجنگ کو آبنائے ملاکہ کے اس تنگ یا بھاری ٹریفک والے مقام کا فیصلہ کن متبادل فراہم کرتی ہے جہاں سے اس کی تیل کی زیادہ تر درآمدات گزرتی ہیں۔ یہ پائپ لائن جو کہ 2013 تک متوقع طور پر سالانہ ایک کروڑ ٹن تیل ادھر سے ادھر بھجوا دیا کرے گی، مغربی قازقستان سے شروع ہو کر تیان شان پہاڑوں کی سرنگوں سے گزرتی ہوئی زنجیانگ تک جا پہنچتی ہے جو کہ شمالی مغربی چین میں مسلمان اکثریت کا ایک خودمختار و کشیدگی کا حامل علاقہ ہے۔

یورینیم کے ایک عظیم الشان معاہدے کے ساتھ ہی قدرتی گیس کے ایک وسیع ذخیرے کے حصول کی بدولت بھی چائنہ انک (China Ind) کے مغربی یورپ کے حجم کے برابر ملک قازقستان سے وسیع تر مفادات وابستہ ہو چکے ہیں۔ جب چینی صدر ہو جنتاؤ نے جون میں قازقستان کا دورہ کیا تو وہ اپنے ساتھ 205 ارب ڈالر کے سرمایہ کاری اور کرنسی کے معاہدے بھی لے گئے۔ اس برس قازقستان کا چین کے ساتھ تجارت کا حجم روس کے ساتھ اس کی تجارت کے حجم سے بھی بڑھ سکتا ہے: ہنو کے مطابق تجارت کا حجم 4 برسوں میں دو گنا ہو کر 40 ارب ڈالر تک جا پہنچے

گا۔اتی راؤ میں سائنو پیک کے ملازم لیووئی نے وسطی ایشیا کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی پر مشتمل قوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تبصرے کے انداز میں بتایا کہ ''پورے قازقستان کی آبادی ہمارے کسی بھی بڑے شہر کی آبادی سے کم ہے''۔''تاہم اس کے پاس قدرتی وسائل کی فراوانی ہے۔اس لئے اگر ہم انہیں خریدنا اور قازقستان کی ترقی میں کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟''

تاہم پیسہ اس سارے کھیل میں محض ایک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔چین اپنے ہمسایہ قازقستان میں نسلی اقلیت کے ان یغور باشندوں (Uighurs) پر بھی دباؤ بڑھتا رہا ہے جو چینی ظلم و ستم سے تنگ آ کر زنجیانگ کے شہروں سے ہزاروں کی تعداد میں فرار ہو کر چند عشروں سے یہاں آباد ہوتے جا رہے ہیں۔چنانچہ وسطی ایشیا کی تازہ ترین گریٹ گیم کی شکل کچھ یوں بنتی ہے: تین بڑی طاقتوں کے مابین شدید مسابقت، قدرتی وسائل میں گہری دلچسپی، اور فرقہ ورانہ فسادات۔ تاہم ایک چھوٹا سا سوال یہ ہے کہ اس کھیل میں اب کون آ گئے ہے۔اس تجسس کا اظہار اتی راؤ ریفائنری میں ڈائریکٹر فار کیپیٹل کنسٹرکشن اینڈری کنسٹرکشن نورلان کیکن نے کہا:''اس کے مطابق ہر کوئی جانتا ہے کہ مستقبل چین کا ہے۔''

زنجیر میں چینی کڑی

1997 میں جب صدر نذر بائیوف نے آندھیوں کی زد میں رہنے والے وسیع میدانی قطع میں واقع ایک فوجی چوکی کو قازقستان کے نئے دارالحکومت میں تبدیل کر دیا تو اس وقت سے آستانہ(Astana) ایک حیرت انگیز تعمیراتی فروانی کے ساتھ پروان چڑھ چکا ہے وزارت خزانہ کی عمارت ڈالر کی ایک بہت بڑی شکل کی طرح نظر آتی ہے۔ایک بلاک میں مجھے کوریا کی طرز کی بڑی سی عمارت، ایک سویڈش بیئر ہال اور یرٹس یعنی قزاق باشندوں کی طرف سے استعمال کئے جانے والے روایتی خیموں کا انبار نظر آتا ہے۔یہاں نذر بائیوف یونیورسٹی بھی ہے اور چین کی عظمت کے استحکام کی علامت بیجنگ پیلس بھی بمع ایک عدد چینی مینار کے موجود ہے جو کہ گھومنے والے ریستوران کے ساتھ مکمل شکل اختیار کر لیتا ہے، اور یہ عمارت اگر ایونیو آف ایٹرنل پیس پر موجود ہوتی تو بالکل قدرتی ماحول کا حصہ نظر آتی۔

قازقستان میں چین کا اثر ورسوخ ابھی ماسکو کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ روسی غلبے کے ایک طویل دور کے بعد قازقستان کی ایک تہائی آبادی نسلی طور پر روسی باشندوں پر مشتمل ہے۔ بہت سے قزاق باشندے بھی آپس میں روسی بولتے ہیں، حالانکہ اسکولوں میں تعلیم صرف قزاق زبان میں دی جاتی ہے۔ تاہم یہ مشرق کی طرف واقع گنجان آباد دیو نما وجود چین کی مداخلت کا ثمر ہی ہے کہ یہاں روسی عفریت کی بجائے قوم پرستی کی علامات ہی ابھری ہیں۔ مئی میں قزاقستان کی سب سے بڑی حزب مخالف جماعت نے چین کے خلاف سینکڑوں لوگوں پر مشتمل زبردست مظاہرہ کروایا۔ مظاہرین ان افواہوں پر سیخ پا ہو رہے تھے کہ قازقستان چینی کسانوں کو زمین پٹے پر دینے کا ارادہ رکھتا ہے؛ مظاہرین اپنے ہاتھوں میں ایسی تصاویر اٹھائے ہوئے تھے جن میں قزاقی باشندے کے گلے میں جوا تھا جب کہ ہل چلانے والا چینی تھا۔

قازقستان میں اپنے تمام سفروں کے دوران مجھے حملہ آور چینی جتھوں کی کہانیاں سننے کو ملیں۔ بعض غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق اس نیم آباد سرزمین پر تقریباً 5 لاکھ چینی باشندے قدم جما چکے ہیں۔ مجھے اس تعداد میں چینی باشندوں کی آمد کا کوئی ثبوت نہیں ملا، اور قازقستان کی وزارت محنت وسماجی تحفظ نے ملک کے اندر غیر ملکی کارکنوں کی تعداد کو محدود کرنے کے لئے کوٹہ مختص کر دیا ہے۔ مگر 2009 میں آستانہ سے جاری کردہ امریکی برقی پیغام کے مطابق جو کہ وکی لیکس نے عوام کے ملاحظے کے لئے بغیر اجازت منظر عام پر لانے کا خطرہ مول لیا تھا، ''جب ایک مرتبہ چینی کہانیاں معاہدے پر دستخط کر دیتی ہیں تو وہ اس کے گرد دائرہ کھینچ لیتی ہیں اور پھر اپنا ساز وسامان اور افرادی قوت، زیادہ تر غیر قانونی انداز میں، لے آتی ہیں اور اس منصوبے کی بڑی سختی سے بیجنگ کے توسط سے نگرانی کرتی ہیں۔ چینی سفارت خانے کے ایک عہدیدار نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بعض اوقات چینی کمپنیاں قازقستان کے نقل مکانی اور محصولات کے قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سارے چینی کدھر غائب ہو گئے ہیں؟ آخر کار میری قازقستان کے سب سے بڑے شہر الماتے کے اندرونی علاقوں میں واقع گولڈن ڈریگن ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ کی چھت پر واقع ایک عدد کنکریٹ کے ڈبے میں رہنے والے چینی گروہ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ باورچی یانگ یہاں کوئی کارنامہ انجام دینے نہیں آیا۔ ''میں یہاں

قازقستان میں صرف ایک ہی مقصد کے لئے آیا ہوں اور وہ ہے پیسہ" وہ اظہار رائے کرتا ہے۔ صرف سخت جان لوگوں کے لئے موزوں اس کی بیرک سے جس میں کہ اس کے ساتھ بہت اور لوگ بھی رہتے ہیں، مجھے تیان شاہ کے برف کے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور آسمانوں کی چھوتی ہوئی چوٹیاں جو چین، قازقستان اور کرغزستان کی سرحدوں کا احاطہ کرتی ہیں، صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا یہ منظر اسے دلکش لگتا ہے، میں پوچھتا ہوں۔ وہ کندھے اچکا کر رہ جاتا ہے۔ "میں جب یہاں ہوتا ہوں تو تھکاوٹ کے مارے ادھر نظر ہی نہیں جاتی"، وہ اپنی باورچی وردی کی سفید قمیض کے بٹن لگاتے ہوئے کہتا ہے، "مجھے اب کام پر جانا ہے"۔

یغور کا مسئلہ

دوسرے لوگوں کے ذہن زیادہ اہم مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ الماتے کے ایک صاف ستھرے رہائشی علاقے میں میری نظر کار کے ڈیش بورڈ پر آویزاں ایک جھنڈے پر پڑتی ہے: نیلے آسمان کے پس منظر میں اسلام کی علامت ہلال اور ستارہ۔ یہ مختصر دور کے لئے قائم خود اپنے طور پر اعلان کردہ (34-1933 اور 44-1943) میں، تاریخ کے انتہائی فراخدلانہ تخمینے کی مطابق یغور لوگوں کی جمہوریہ بنام مشرقی ترکستان کا جھنڈا ہے۔ یہ لوگ اب ایک ایسے خطے میں پھیل چکے ہیں جسے اب زنجیانگ کا خودمختار علاقہ کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ لوگ پسپا ہوتے جا رہے ہیں، حتیٰ کہ اپنے قدیم وطن کے باہر بھی۔ حکومت سے اجازت نامہ حاصل نہ کر سکنے کے باعث یغور سیاسی کارکن سرعام کوئی جلسہ جلوس نہیں کر سکتے۔ کیا میں نے اسی مشرقی ترکستان کا جھنڈا دیکھا ہے؟ اس کا سرعام لہرانا پولیس کی طرف ہراساں کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ "میں اور میرا خاندان 1962 میں اپنے وطن کے اندر ہونے والے بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے بعد چین فرار ہو گئے تھے"۔ اسان ژان نے انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔ اسان ژان ایک 68 برس کا بزرگ ہے جو پیدا تو زنجیانگ میں ہوا تھا اور اب الماتے میں رہتا ہے۔ اس نے مزید تبصرہ کیا "میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ چینی اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ ہمیں اپنی علاقائی حدود سے باہر بھی کنٹرول کریں گے"۔

یغور کے خلاف چینی مہم میں 2009 میں اس وقت اور شدت پیدا ہو گئی جب زنجیانگ

میں یغور، چین کی ہان (Han) اکثریت اور وحشت زدہ سیکیورٹی فورسز کے درمیان ہونے والے فسادات کا نتیجہ 200 کے قریب ہلاکتوں کی صورت میں نکلا۔ اس وقت سے لے کر اب تک چین نے وسطی ایشائی اقوام اور روس پر مشتمل دفا کی تنظیم شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن (Sco) کی خدمات حاصل کرتے ہوئے، انسانی حقوق تنظیموں کے مطابق ایک سوچے سمجھے نسلی جبر کے لئے عالمی سطح پر حمایت کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ مئی میں تاجکستان اور کرغزستان نے چین کے ساتھ ایس سی او کے تعاون سے ہونے والی فوجی مشقوں کا انعقاد کیا تاکہ بیجنگ کی طرف سے ''مشرقی ترکستان دہشت گرد گروہوں'' کا خطاب پانے والی تنظیموں کی کچلا جا سکے۔ اگرچہ چین کے دعوے کے مطابق بڑے پیمانے پر یغور دہشت گرد تنظیمیں موجود ہیں، تاہم غیر ملکی ماہرین میں ان کی رسائی اور حجم کے حوالے سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ الماتے میں یغور کمیونٹی کے رہنما عبدالشید تردیوف کے مطابق ''چین دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ ہم سب دہشت گرد ہیں''۔ تاہم ''ہم زیادہ سے زیادہ یہی چاہتے ہیں کہ ہمیں وقار اور آزادی سے اپنی ثقافت اور روایات پر چلنے کا حق عطا کیا جائے''۔

جون میں ایس سی او نے کرغستان میں اپنی دسویں سالانہ سربراہی کانفرنس منعقد کی۔ ایس سی او کے اجلاس سے پہلے قزاق شہریت رکھنے والے یغور باشندوں کو واشنگٹن میں ہونے والی یغور کانفرنس میں شرکت سے روکنے کے لئے ملک چھوڑنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ (اور یہی کچھ کرغستان میں ہوا)۔ اس وقت ارشدن اسرائیل کو جو 2009 میں چین سے فرار ہو کر کرغستان پہنچ گیا تھا اور اسے سویڈن میں سکونت دینے کے لئے ابتدائی طور پر اقوام متحدہ کے پناہ گزین کا درجہ دیا گیا تھا، واپس پھر عوامی جمہوریہ میں بھجوا دیا گیا، ایک طرح سے یغور باشندوں کی جبری بحالی کا عمل جو کہ پورے وسطی ایشیا میں دہرایا جاتا ہے۔ ارشدن کو سرکاری طور پر جون میں دہشت گرد قرار دے دیا گیا تھا: اقوام متحدہ نے اسے پناہ گزین قرار دینے کا اعلان اس سال کے شروع میں ہی منسوخ کر دیا تھا۔ مگر کرغستان میں اس کے ایک رشتہ دار کا کہنا ہے کہ وہ کوئی انقلابی یا انتہا پسند باغی نہیں ہے۔ واشنگٹن میں قائم کردہ نفع کے مقصد کے بغیر کام کرنے والی ذرائع الاغ کی تنظیم ''فی ایشیا'' کا یقین ہے کہ اس 38 سالہ شخص کو صرف آزادی اظہار کے جرم میں، خاص طور پر 2009 کے فسادات کے بعد سیکیورٹی اداروں کی طرف سے کی جانے والی سخت کاروائیوں کے

حوالے خیالات کے اظہار کی بنا پر عتاب کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔اس کی سالی آسیہ کریمانوف کے مطابق ''ارشدین کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا''۔مگر مجھے یقین ہے کہ ہم اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھیں گے''۔

کھیل شروع

واپس اتی راؤ آتے ہیں۔سوویت دور کی ایک وسیع شاہراہ کے کنارے ایک مٹیالا سا چینی جھنڈا پھڑ پھڑا رہا ہے۔تاہم باوجود اس کے قازقستان سے پہلے سے زیادہ تیل نکالا جارہا ہے، ملکی تیل کے مرکز شہر میں غیر ملکی جھنڈوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔مئی میں رائل ڈچ شیل نے اتی راؤ میں اپنے دفاتر بند کر دیئے اور کاشغان کے ساحلی علاقوں سے قریب جہاں کہ 20 برس میں دریافت ہونے والے تیل کے ذخائر میں سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے، اپنے تمام ترقیاتی منصوبے روک دیئے۔اس سے اگلے ماہ ناروے کی ایک کمپنی نے بھی کاشغان سے نکلنے کا اعلان کر دیا۔مغربی اداروں کا حکومت سے ترقیاتی منصوبوں کی لاگت پر جھگڑا چلا آ رہا ہے کیونکہ قزاق حکومت ملکی تیل کی دولت میں زیادہ سے زیادہ حصے کے لئے ریاست کے کردار کو بڑھانا چاہتی ہے۔قزاق آئیل اینڈ گیس منسٹر صوت من بائیوف کو امریکہ، روس، برطانیہ اور اٹلی سے تعلق رکھنے والے مغربی اداروں کے ایک بڑے گروپ پر کراچا گانک نامی تیل اور گیس کے ایک وسیع ذخیرے کے لئے ترقیاتی منصوبے کی تکمیل کے حوالے سے اعتماد نہیں ہے۔

دوسرے ممکنہ شراکتی ادارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔وکی لیکس کی جانب سے 1010 میں آستانہ سے جاری کردہ امریکی سفارت خانے کے ایک اور برقی پیغام کے انکشاف کے مطابق قزاق آئل کمپنی کے ایک سابقہ نائب صدر نے اخفائے راز کی شرط پر بتایا کہ چینی اور روسی مفادات ''ایک گِدھ کی طرح منڈلانے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں''؛اس امید کے ساتھ کہ کاشغان اور کراچا گانگ کے حوالے سے اداروں کا گروپ اندرونی اختلافات کی بناء پر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور پھر وہ صورتحال کو اپنے موافق استعمال کر سکتے ہیں''۔ماحولیات پر کام کرنے والی ایک مقامی این جی او کاسپیئن نیچر کے سربراہ مخامبت خاکیموف کی قیاس آرائی کے مطابق سوچنے کی بات یہ ہے کہ ریفائنری کو مکمل طور پر دوبارہ فعال بنانے کے لئے چینی اداروں کی بولی دوسرے

غیر ملکی اداروں کی پیشکش سے 2ارب ڈالر کم کیوں تھی۔''اس میں کیا نقصان پوشیدہ ہوگا؟ ہمارا ماحولیاتی توازن۔ ہماری افرادی قوت''۔ وہ تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔''اگر ہمارے تیل میں اتنے سارے ملکوں کو دلچسپی ہے تو ہمیں ان میں باہمی مقابلے کے ذریعے اپنے لوگوں کے لئے بہترین معاہدہ حاصل کرنا چاہیئے، نہ کہ ان حالات کے ستم کا شکار کر دینا''۔ایک گریٹ گیم کا رخ باہم مخالف غیر ملکی طاقتوں کی طرح کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے نتیجے کا انحصار مقامی کھلاڑیوں کی چالبازیوں پر بھی ہوتا ہے۔قازقستان کی بین الاقوامی سازشوں کی داستان شروع ہوا چاہتی ہے۔

بخارا سے اخراج

مائیکل شمان

میں جیسے ہی قدیم بخارا کی تنگ گلیوں سے گزرا تو دوسرے یہودی اس سے مختلف سمت گامزن تھے۔ ازبکستان میں اس دور دراز کی وسطی ایشیائی تجارتی چوکی میں یہودی آبادکار صدیوں سے خوشحالی کی جانب گامزن ہیں۔ وہ بھی اپنے مسلمانوں ہمسایوں کی طرح کچی اینٹوں کے مکانات اور خوبانی کے درختوں اور باغات کے اندر بنی ہوئی سینانے کی سایہ دار جگہوں کا احاطہ کرنے والی چار دیواری والی عمارتوں میں رہتے تھے۔ مگر جب میں نے 2002 میں وہاں کا دورہ کیا تو بہت سے یہودی پہلے ہی وہاں سے جا چکے تھے، بعض تو اتنی جلدی میں وہاں سے گئے کہ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ مسلمان خاندانوں نے عبرانی دعاؤں کی پرانی کتابیں چند ڈالروں کے عوض گلیوں میں سیاحوں کو فروخت کر دیں۔ معبدوں میں جو کہ کسی پرانی عمارت کے اندر ایک سادہ سے کمرے سے کچھ ہی زیادہ بڑی ہوئی ہوں گی، باقی بچ رہ جانے والے تھوڑے سے یہودی بھی وہاں سے نکل جانے کے لئے، اسرائیل کی طرف، یا امریکہ کی طرف یا کہیں بھی جانے کے لئے جہاں پر انہیں پناہ مل سکے، بے تاب و بے قرار تھے۔

یہ سب کتنا غمناک لگتا ہے، میں نے سوچا ایک پوری کی پوری تہذیب ہی ختم ہو رہی تھی۔ کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہودی وسطی ایشیا میں سب سے پہلے کب پہنچے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ 2500 برس قبل اس وقت یہاں پہنچے تھے جب فارسیوں نے اسرائیلیوں

کو بابل میں جلاوطنی سے نجات دلائی تھی۔ وہ یقیناً وہاں اپنے ہی مخصوص طرز کے یہودی مذہب اور زبان کے فروغ کے لئے، جو کہ فارسی کی ہی ایک قسم ہے جسے بخارین کہا جاتا ہے، کافی عرصہ وہاں رہتے رہے۔ اور پھر کچھ ہی برسوں میں وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک ماہر بشریات الانا کوپر کے اندازے کے مطابق، جس نے اس مخصوص گروہ کا مطالعہ کیا ہے، سوویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے وقت وسطی ایشیا میں کوئی 50,000 کے قریب بخارین یہودی رہ رہے تھے۔ اس کا یقین ہے کہ اب صرف ایک ہزار سے بھی کم رہ گئے ہیں۔ صہیونیوں اور عربوں کے درمیان اسرائیل کا جھگڑا اب مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک وسیع تر مذہبی فساد کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ساری اسلامی دنیا سے یہودیوں کے اجتماعی انخلاء کی صورت میں نکلا ہے۔ گذشتہ 60 برسوں کے دوران سینکڑوں ہزاروں یہودی الجیریا سے لے کر ایران تک مسلمان ملکوں سے فرار ہو چکے ہیں۔ یہ اخراج تاریخ کا پہیہ پیچھے گمانے کا مترادف ہے۔ اگرچہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان حضرت محمد ؐ کے زمانے سے ہی کشمکش چلی آ رہی ہے تاہم یہودیوں سے مسلمان ممالک میں بہتر سلوک کیا گیا بہ نسبت عیسائی ممالک کے۔ صلیبیوں نے نے یہودیوں کو قتل کر دیا؛ صلاح الدین ایوبی جیسے مسلمان رہنماؤں نے ان کو تحفظ دیا۔ یہودیوں نے عیسائی وزیگوتھز کی طرف سے اذیتوں کے خاتمے کے لئے سپین میں مسلمانوں کی فتح میں تعاون کیا۔ جب 1492 میں فرڈی ننڈ اور ازابیلا نے یہودیوں کو دیس نکالا دیا تو انہیں مسلمان ممالک میں ہی پناہ ملی۔

جدید وسطی ایشیا میں مسلمان اور یہودی ایک مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متحد تھے، یعنی روسیوں کے خلاف جنھوں نے دونوں مذاہب کو ہی کچلنے کی کوشش کی۔ تاہم 1991 میں ازبکستان کی آزادی کے ساتھ ہی یہ سب کچھ تبدیل ہو کر رہ گیا۔ قوم پرستی کے جنون میں نئی حکومت نے ازبک زبان کی ترویج شروع کر دی اور مسجدوں کی بھرمار ہو گئی، جس کی وجہ سے یہودی اپنے ہی ملک میں اجنبی بن کر رہ گئے۔ اس سے بھی بدتر صورتحال یہ ہوئی کہ ان کے طویل عرصہ سے مسلمان ہمسائے بھی ان کے خلاف ہو گئے۔ تاشقند کے ایک سابقہ باشندے تمارا بنجامن کے مطابق ''لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ واپس وہیں چلے جاؤ جہاں سے تم آئے ہو۔ یہ تمہارا وطن نہیں ہے''۔

ہزاروں دلگیر بخارا کے یہودیوں کے ساتھ، بنجامن نیویارک میں بلدیہ کوئین میں جا

بسا، جہاں انہوں نے اپنی پرانی زندگی کو از سر نو تخلیق کرنے کو کوشش کی۔ بیکریوں میں سمرقند کی گلیوں میں ہر جگہ موجود خستہ، نرم اور گول نان فروخت ہوتے ہیں۔ حلال کھانوں کی دوکان پر کباب اور بھیڑ کی کھوپڑی کا سوپ ملتا ہے۔ معبدوں میں راہب اپنے وعظ بخارین میں دیتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود امریکہ جیسے مختلف تہذیبوں کے ملاپ والے ملک میں بچی کھچی بخارین روایت آہستہ آہستہ مدھم پڑ جائے گی۔

تاشقند سے تعلق رکھنے والا73 برس کا آرن اورنوف اس رجحان کو روکنا چاہتا ہے۔ ایک روایتی یہودی اسکول یا شیوا کے اندر ارونوف نے اپنی ثقافت کو محفوظ کرنے کے لئے ایک عجائب گھر کھول لیا۔ تنگ عمروں میں پیلی پڑ جائے والی پرانی تصویروں پرانے ملبوسات اور پھٹی پرانی کتابوں کے بے ترتیب ڈھیر لگے ہوئے ہیں، جس طرح کہ مکان کی اوپری منزل کا کوئی کمرہ ایک دادا جان کی پرانی یادگاروں سے اٹا پڑا ہو۔ گھر میں ارونوف نے مکان کا پچھلا حصہ بخارین گارڈن کے نقش ثانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ تازہ تازہ لگے ہوئے خوبانی کے درختوں کو پانی دینے کے ساتھ ہی باغ کے اندر بیٹھنے کے لئے بنی ہوئی سایہ دار جگہوں میں پلانے کے لئے چائے پیش کرتا ہے۔ امریکہ میں20 برس سے زائد عرصے سے رہتے چلے آنے کے باوجود وہ ابھی تک اپنی نوجوانی کے دور کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور کچی اینٹوں والے مکانات کو یاد کرتا ہے۔ کیا وہ کبھی واپس جائے گا؟ اپنے اداس لہجے میں بولتے ہوئے ارولوف کہتا ہے: ”اب بہت دیر ہو چکی“۔

☆☆☆☆☆

تاریخ ایک تھالی میں

آنیا سیزادلو۔ بیروت

پیچ دار قسم کے کنونشن سنٹر میں جہاں بیروت کا سالانہ فوڈ اینڈ ریسٹورنٹ انڈسٹری ٹریڈ شو پیش کیا جا رہا ہے، مہمان ایک مشہور زمانہ باورچی کے گرد اکٹھے ہوئے کھڑے ہیں جو کہ مشرق وسطیٰ کے کھانوں کی کسی اہم قسم کو جدید انداز میں پکانے کی ترکیب بتا رہا ہے: ایک تھالی میں انگور کے تین عدد چھنگلی برابر بھرے ہوئے پتے اور ان پر تھوڑی سی چٹنی لگا کر بڑے اہتمام کے ساتھ مہمانوں کے آگے رکھ دیتا ہے۔ اچانک مجمع کے اندر سے کوئی آواز آتی ہے: ہریسہ! سب لوگ اس باورچی کو چھوڑ کر تیزی سے ہال کی دوسری سمت ایک اور کاونٹر کی طرف بڑھ جاتے ہیں، جہاں ایک گنجا اور گول مٹول سا باورچی ایک برتن کو اتنے وسیع دائرے میں گھما رہا ہے جتنا کہ وہ خود ہے۔ جلد ہی لوگ ایک بھیڑ کے اندر سے بڑے فتح کن انداز میں سے خاکستری سے رنگ کے دلیے جیسی چیز سے بھری ہوئی کاغذی تھالیاں لئے برآمد ہوتے ہیں۔ مگر ظاہر میں جو نظر آتا ہے وہ دھوکہ ہوتا ہے: ہریسہ جو کہ گوشت مصالحہ جات اور دانہ دار اجناس کا ملغوبہ ہوتا ہے واقعی وہ چیز ہے جس کے لئے ہجوم کرنا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

لوگ سینکڑوں بلکہ ممکنہ طور پر ہزاروں برس سے دھیمی دھیمی آنچ پر پکنے والے اس گاڑھے سے مواد کو بڑے شوق سے کھاتے چلے آ رہے ہیں۔ آج ہریسہ یا اس کا فارسی یا جنوبی ایشیائی مترادف یعنی حلیم آپ کو مشرقی بحیرہ روم سے لے کر کشمیر تک ایک وسیع تر اسلامی دنیا میں ہر

جگہ نظر آجائے گی۔

تاہم ہریسہ محض اسلامی دنیا کی لذت و لطافت نہیں ہے۔ غذائی مورخ اور کھانا پکانے کی ترکیبوں پر مشتمل کتاب کی مصنفہ کلاڈیا روڈن کے مطابق زمانہ وسطی میں اندلس کے یہودی اسے ہفتے کے روز کھاتے تھے، بیسویں صدی کے عراقی یہودیوں نے گندم اور گوشت کو پیس کر پکانے کے لئے مسلمان باورچیوں کی خدمات حاصل کی تھیں، اور یمنی یہودی آج تک پکاتے چلے آرہے ہیں۔ شام اور لبنا میں عیسائی لوگ اسے مفروضے کا تہوار منانے کے لئے پکاتے ہیں۔ اور عراق و لبنان میں شیعہ لوگ اسے حضرت محمد ؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی یاد والے دن پکاتے ہیں۔ بھارت کے شہر حیدرآباد میں ہندو اس امر پر اختلاف کرتے نظر آتے ہیں کہ سب سے لذیذ ہریسہ کہاں سے مل سکتا ہے اور آیا کہ یہ بکری یا بھیڑ کے گوشت کے ساتھ زیادہ مزہ دیتا ہے۔

ایمان یا عقیدہ بھی بعض اجزا کی طرح مختلف ہو سکتا ہے، مگر تمام ہریسوں میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے: یہ مل جل کر کھانے کے لئے ہوتا ہے۔ کھانے پکانے کی ترکیبوں کی کتاب کی مصنفہ اور مشرق وسطیٰ کے کھانوں کی ماہر انیسہ پیلو کے مطابق "دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آپ کو اسے بانٹ کر کھانے کی روایت تمام مذاہب میں ملے گی"۔ انیسہ کی دادی جو کہ ایک لبنانی گاؤں رچمایا میں سینٹ میری کے تہوار پر غریبوں کے لئے ہریسہ بنایا کرتی تھی اسے "سخاوت کی ڈش" کہتی ہے۔

مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں ہریسہ کا بے شمار مواقع پر حوالہ دیا گیا ہے۔ ساتویں صدی کے اواخر میں دمشق کے خلیفہ معاویہ سے، جو کہ تیزی سے توسیع پذیر اسلامی دنیا کا رہنما تھا، یمن سے عرب یہودیوں کے ایک وفد نے ملاقات کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اہم ریاستی، مذہبی اور تجارتی معاملات پر تبادلہ خیال کیا۔ تاہم ازمنہ وسطیٰ کے مورخوں کے مطابق، جنہوں نے اس ملاقات کا احوال لکھا ہے، خلیفہ نے جو سب سے پہلا سوال کیا وہ ہنگامی نوعیت کا تھا: کئی برس قبل عرب کی طرف ایک سفر کے دوران اس نے ایک نہایت نفیس قسم کی ڈش کھائی تھی جو کہ گندم اور گوشت کا آمیزہ تھا۔ کیا وہ اسے پکانے کی ترکیب جانتے ہیں؟ وہ جانتے ہیں۔

ہریسہ پکانے کی پہلی لکھی ہوئی ترکیب کا سراغ دسویں صدی عیسوی میں ملتا ہے، جب ابن سیار الوراق نامی ایک لکھاری نے اسلام کے سنہری دور کے خلفاء کی پسندیدہ ڈشوں کی تراکیب

پر مبنی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اس نے اپنی کتاب بہ عنوان ''کتاب الطبع'' میں جو کہ کھانے کی ترکیبوں کی عربی کی سب سے قدیم دستیاب کتاب ہے، جس طرح کی ترکیب بیان کی ہے وہ حیرت انگیز طور پر اس کھانے کی طرح ہے جو مشرق وسطیٰ میں آج تک پکایا اور کھایا جا رہا ہے۔

1325 تک جبکہ ابن بطوطہ اپنے گھر سے نکل کر تاریخی سفر پر روانہ ہو چکا تھا، وہ سنہرا دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ تاہم اسلامی سلطنت ابھی بھی خاطر خواہ اہمیت رکھتی تھی، اور جب ابن بطوطہ اس میں سے سفر کرتے ہوئے گزر رہا تھا تو راستے میں سراؤں کا ایک وسیع سلسلہ جو کہ زیادہ تر مذہبی علماء اور صوفیاء کے زیرِ انتظام تھا، عوام کے لئے آرام کے علاوہ دنیا کے چاروں اطراف سے آنے والے مسافروں سے ملنے جلنے کا وسیلہ بھی تھا۔ وہ زبان، نماز، سفری مشوروں اور غلاموں کے علاوہ جس اور چیز میں مشترکہ دلچسپی رکھتے تھے وہ ہریسہ تھا۔ کزارن کی دور دراز ایرانی چوکی میں، نوجوان مہم جو نے ابو اسحاق نامی ایک مشہور مہمان نواز مسلمان کی سرائے میں قیام کیا۔ کئی عشروں کے بعد ابن بطوطہ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ ''ہر مہمان کی آؤ بھگت، خواہ وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتا ہو، گوشت، گندم اور گھی کے بنے ہوئے ہریسے سے کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں''۔

اس ڈش کی تیاری کا طریقہ صدیوں سے ایک ہی چلا آ رہا ہے: باورچی گندم کو پوری رات ہلکی ہلکی آنچ پر پکاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ گندم کا دانہ پھٹ جاتا ہے اور اندرونی تہہ باہر نکل آتی ہے۔ پھر اس میں زیادہ معیار کا جز ویفی گوشت ڈال دیا جاتا ہے اور اسے بھی اس وقت تک ہلا ہلا کر پکایا جاتا ہے جب تک گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اچھی طرح مدغم ہونے کے بعد ہریسہ نہ بن جائے۔ اس سارے عمل میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، بعض اوقات تو پورا دن بھی۔ جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو باورچی ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں، بعض اوقات براہ راست دیگ کے ساتھ، اور پھر ہریسہ تمام مہمانوں بشمول زائرین، غرباء، ہمسایوں اور اجنبیوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔

آج کل بہت لوگ پریشر ککر استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے پکانے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور چمچ سے ہلانے کی بھی زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ مگر جنوبی لبنان کے ایک دیہات میں میری دوست راد ابلمان کا وسیع کنبہ ہریسہ ابھی تک اسی پرانے انداز میں پکاتا اور عاشورہ کے دنوں میں بڑی مقدار میں مہمانوں اور غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ چند برس قبل اس نے مجھے بھی مہمانوں کے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ دھوپ سے بھرے ہوئے باورچی خانے میں مرغیوں کی

ہڈیوں سے پُر ایک بڑے سے تسلے کے ساتھ ہی چولہے پر ایک دیگچہ دھیمی آنچ پر پک رہا تھا۔فرش پر المونیم کا ایک بڑا سا برتن جو کہ کوڑے کی ٹوکری سے بڑا اور گاڑھا ہوگا، ایک پرانے طرز کے دھاتی چولہے پر جو کہ گیس (propane) کے ٹینک سے جڑا ہوا تھا، بڑی احتیاط سے دھرا ہوتا تھا۔

آٹھ عدد عورتیں جنہوں نے نیچے تک آٹے میں لتھڑی ہوئی اونی صدریاں پہنی ہوئی تھیں میرے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی چلاّ چلاّ کر متضاد قسم کی ترکیبیں پڑھنی شروع کر دیں بعض گندم کو راتوں رات بھگو کر رکھ دیتے ہیں؛ دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ بے حرمتی ہے۔ بعض لوگ پانی اور گوشت برابر مقدار میں ملاتے ہیں اور بعض پانی بوقت ضرورت ساتھ ساتھ ملاتے جاتے ہیں۔بعض گندم اور گوشت کی بالکل برابر برابر مقدار استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض گوشت برائے نام ہی ڈالتے ہیں۔شمالی لبنان کے باورچی دار چینی اور ایک خاص مصالحہ استعمال کرتے ہیں۔جنوبی علاقوں کے باورچی چھوتی الائچی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔مشرقِ وسطیٰ والے عموماً اس کے اوپر دار چینی اور پگھلا ہوا مکھن ڈال دیتے ہیں جبکہ جنوبی ایشیائی بھنی ہوئی پیاز۔

راد کے خاندان کی خواتین نے 3 بجے دن پکانا شروع کیا اور رات کو 2 بجے تک پکاتی رہیں اور پھر سو گئیں۔پانچ گھنٹے بعد اٹھ کر انہوں نے ہریسے کو دوبارہ ہلانا شروع کیا۔یہ ایک اچھا خاصا کام لگ رہا تھا۔میں نے پوچھا کہ انہوں نے اتنی مشقت کیوں کی تو کہنے لگیں کہ ''یہ ایک علامت، ایک رواج ہے''۔ایک ملاک نامی عورت نے کہا۔''یہ اس طرح ہے جیسے آپ چرچ میں شراب پیتے اور ڈبل روٹی کھاتے ہیں''۔دوسرے لفظوں میں ایک مقدس فریضہ: ایک ایسا جذبہ جسے ابو اسحاق بھی سراہے بغیر نہ رہتا۔

انہوں نے میرے لئے ایک بڑا سا چمچ ڈالا اور اس کے اوپر دار چینی چھڑک دی۔یہ بڑا نرم اور مزے کا تھا، جس پر دار چینی، لونگ اور زیرے کی مہک مزے کی لگ رہی تھی۔سلطنتیں اور خلافتیں آتی جاتی رہیں گی مگر کچھ چیزیں ان سے زیادہ دائمی ہوتی ہیں: روایات، مہمان نوازی، ہریسہ۔

☆☆☆☆☆

ایک عقیدہ، کئی رُخ

زہیر عبدالکریم

بعض اوقات روحانی بصیرت کا راستہ ترکی کے بازار سوق سے ہو کر نکلتا ہے۔ تقریباً 20 برس قبل میں اور میری بیوی استنبول کے ایک وسیع عثمان بازار میں قالینوں کی خریداری کے لئے پھر رہے تھے۔ ایک سیلز مین نے جو کہ بغیر داڑھی مونچھوں والا مسلمان تھا، ہمیں ایک صوفیانہ رسم مشہور زمانہ گھومنے والے درویشوں کی طرز کی نہیں، بلکہ اپنے ایک بزرگ کے ہاں ہونے والی حقیقی اجتماعی عبادت میں شرکت کی دعوت دی۔

صوفی نظریئے کے مطابق آپ خدا سے ذاتی طور پر براہ راست ہم کلام ہو سکتے ہیں، جس کے لئے بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ مراقبے کی حالت میں بولنا بھی ہے۔ اور یہ وہ چیز تھی جس کا ہم نے مشاہدہ کیا۔ آفندی (بزرگ) لوگوں کے کمرے رنگین چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے بوڑھے، بچے، جوان یعنی ہر طرح کے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے، جو سب کے سب بڑے ردھم کے ساتھ عربی میں کلمہء شہادت کا پہلا حصہ دہرا دہرا کر پڑھ رہے تھے: ''لا اِلہ اِلاّ اللہ''۔ بہت سے لوگ وجدان کی کیفیت میں تھے۔ میری بیوی، جو کہ ایک چینی نژاد امریکی ہے، وہاں موجود واحد عورت تھی جس نے کہ نقاب بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو، مگر ہمیں یہ تجربہ بہت مسحور کن، روح پرور اور کیف آور لگا۔ میں سوچتا رہا تھا کہ اسلام کے دوسرے پہلوؤں کے برعکس، یہ شکل یا پہلو کتنا تسکین بخش اور لطیف تھا۔

بہت سے مسلمان مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ صدیوں سے صوفیاء اپنے ساتھ کٹر مسلمانوں کے ستم کا نشانہ بنتے آئے ہیں، جو کٹر نظریات کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ صوفی نظریئے کی انفرادیت اور ڈی آئی وائی یا اپنی مدد آپ کا اصول شریعت کے قوانین، سنت اور قرآن کی روایتی تشریح کے مطابق نہیں ہے۔ اس بنیاد پر عناد یا مخالفت مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر ابن بطوطہ، جو ویسے ایک قدامت پسند مسلمان تھا مگر صوفیا کے روضوں پر حاضری دینا پسند کرتا تھا ایک برس قبل لاہور کے داتا دربار پر ہوتا تو شاید مارا جا چکا ہوتا۔ خودکش بمباروں، غالبًا پاکستانی طالبان، نے بہت سے لوگوں کو یا تو زخمی کر دیا ہے یا پھر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اور یہ صرف صوفیا سے ہی نہیں بلکہ بہت سے اور مسلمان فرقے بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جہاں اسلام ایک طرف وسیع تر اجتماعیت واتحاد واتفاق کے نظریئے کا فخر سے دعویٰ کرنے والا مذہب ہے، وہاں یہ شدت سے بلکہ تشدد کی حد تک اجتماعیت کی نفی یا انتشار کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ آج کے دور کا اسلام روشنی اور اندھیرے کی طرح دو انتہائی مختلف نظریات میں تقسیم نظر آتا ہے: ایک طرف تو یہ امن اور اعتدال کا مذہب ہے جو باقی دنیا کے ساتھ کوئی عناد نہیں رکھتا اور دوسری طرف یہ نفرت اور انتہا پسندی کا ایک ایسا عقیدہ بن کر رہ گیا ہے جس کے تحت ایک الگ دنیا وجود میں لانے کی سازش کی جا رہی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں مگر یہ عقیدہ بے شمار اور حصوں میں بھی تقسیم ہو چکا ہے۔ اسلامی عقائد کی شاخیں عربی کے حروف تہجی کی طرح بہت سے مخالف گروہوں کی صورت میں موجود ہیں۔ جنونیوں اور اصلاح پسندوں کے درمیان عقائد وروایات کے درجوں کا ایک پورا سلسلہ موجود ہے۔ اگرچہ مغرب والے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں، مگر مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟

اسلام میں سب سے پہلی اور بڑی تقسیم شیعہ اور سنی کی صورت میں پائی جاتی ہے، جس کا آغاز پیغمبر ۱ کی 632 میں وفات کے فوراً بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؑ کے درمیان خلافت کے حق کے حوالے سے ہو گیا تھا۔ ربع صدی کے بعد حضرت امام حسینؓ اور ان کے قلیل جانثاروں پر مشتمل سپاہ کو یزید کے لشکر کے ہاتھوں کربلا کے میدان میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ چنانچہ اس سانحے کی یاد میں شیعہ (حضرت علیؓ کے پیروکار) ہر سال رنج وغم کا اظہار دردناک ماتم کی

شکل میں کرتے ہیں۔1980 سے1988 کے دوران شیعہ ایران اور سنی عراق کے درمیان جنگ زیادہ تر دفاع اور سرحدوں کے تعین کی جنگ تھی۔اور اس برس ایک خلیجی طاقت کی طرف سے شیعہ اکثریت کی چھوٹی سی ریاست بحرین میں مداخلت کا تعلق علاقائی بقاء اور سیاست سے تھا۔

یہ سوال مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب بھی فرقہ بندی کا شکار ہیں۔مگر اسلام میں ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو کہ زیادہ متحدہ اور منظم ہوسکتا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیئے۔مسلمان ہونا نمایاں طور پر سیدھا سادہ عمل ہے: آپ نے بس کلمہ شہادت پڑھنا اور ماننا ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز اتنی پر اسرار نہیں ہوتی جتنی کہ عیسائیوں کی مقدس تثلیث (Holy Trinity) یا پھر بدھ مت والوں کا دوبارہ جنم یا آواگون کا پیچیدہ نظریہ یا پھر یہودیت کے درد کا تکلیف دہ صدمہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔اسلام میں پڑنے والی دراڑوں کا تعلق مذہبی اختلاف سے کم اور قیادت، تشریح اور درجہ بندی کے اختلاف سے زیادہ ہے۔آئرش دانش ور ملائز رتھ وین نے اپنی ایک اہم تصنیف ''اسلام ان دا ورلڈ'' میں لکھا ہے کہ اسلام میں اختلافات کا ماخذ عقیدے سے زیادہ سیاست میں ملتا ہے۔

سال میں ایک مرتبہ مسلمان اپنے اختلافات بھلا دیتے ہیں۔حج کے دوران تقریباً ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک ہی مقصد کے لئے حیرت انگیز یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح کی وحدانیت اختیار کر لیتے ہیں جو دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی۔وہ مسلمان جو دوسرے مسلمان کو اختلاف کی بنیاد پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں وہ یقیناً اس جذبے کی نفی کرتے ہیں جس کی خود قرآن میں ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے: ''اللہ سب کو امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے''۔

☆☆☆☆☆

بنیاد پرستی کے رنگ

جیوتی تھوٹم۔کوزہی کوڈے

مالا بار میں کالی کٹ کی طرف چین، ساٹرا، سیلوں، مالدیپ، یمن اور فارس سے بحری جہاز آتے ہیں، اور یہاں ہر جانب سے آنے والے تاجر اکٹھے ہوتے ہیں۔۔۔۔ہم ایسی شان و شکوت کے ساتھ بندرگاہ میں داخل ہوئے جیسی میں نے اس سرزمین پر اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔تاہم یہ ایک ایسی خوشی ثابت ہوئی جس کے بعد پریشانی آ گئی۔

وہ بندرگاہ جہاں ابن بطوطہ نے شاندار انداز میں قدم رکھا ابھی تک لکڑی کے ان چوڑے جہازوں کو خوش آمدید کہتی ہے جو صدیوں سے بحیرہ ہند کی تجارت کو رواں رکھے ہوئے ہیں۔ارس (urus) کہلانے والی کشتیوں میں ناریل کے ریشوں اور مصالحہ جات کی بجائے تعمیراتی سامان لادا جاتا ہے اور مالا بار اب بھارتی ریاست کیرالا کا حصہ ہے۔ تاہم کالی کٹ کی پرانی بندرگاہ آج بھی لوگوں، سامان اور ان نظریات کے آزادنہ تبادلے کی علامت ہے جو کیرالا کی ثقافت کا اہم جزو ہیں۔

اس آزاد خیالی کی روایت کی بنیاد کم سے کم چوتھی صدی میں اس وقت پڑی تھی جب شام کے ایک عیسائی تاجر کی کال کٹ آمد پر اس کا استقبال ایک ہندو راجہ کی جانب سے زمین کے عطیے کی صورت میں کیا گیا۔ پھر ساتویں صدی میں عرب نے ایک ہندو راجہ کو تحریک دی کہ وہ مکہ کا سفر کرے جہاں اس نے اسلام قبول کر لیا اور یوں کیرالا کے مسلمانوں کا روایتی جد امجد بن گیا۔ یہ

روایت بیسویں صدی تک برقرار رہی جس وقت کہ ملایالیز بھی (کیرالا کے لوگوں کو ان کی زبان ملیا کی وجہ سے کہا جاتا ہے) نقل مکانی کرنے والوں کی نئی عالمی لہر میں شامل ہو گئے۔

خود میرا اپنا شامی عیسائی خاندان 1970 کی دہائی میں امریکہ چلا گیا، عین اس زمانے میں جب بہت سے مسلمانوں نے سعودی عرب، بحرین اور ابوظہبی کا رخ کر لیا تھا۔ انہوں نے وہاں سے اپنے وطن پیسے بھجوانے شروع کر دیئے جس کے نتیجے میں ایک سست رفتار زرعی معیشت میں جان پڑنا شروع ہو گئی اور 1980 کی دہائی تک کیرالا نے دنیا کے امیر ملکوں کا معیار صحت اور تقریباً عالمگیر شرح خواندگی حاصل کر لی۔ 1995 میں ماہر ماحولیات بل ممکیبین نے ''کیرالا کے معمے'' کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس امر پہ حیران و پریشان تھا'' کہ یہاں کی آبادی میں پایا جانے والا تنوع بھی، یعنی 60 فی صد ہندو، 20 فیصد مسلمان، 20 فی صد عیسائی، جو کہ باقی ماندہ ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی خوفناک جنگ کے لئے ایک یقینی نسخہ ہے، اس کے لئے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکا''۔

تاہم جیسا کہ ابن بطوطہ نے پیش گوئی کی تھی، خوشی کے بعد پریشانی آ گئی۔ بحیرہ ہند کے گرد منڈلانے والی تاریک لہریں کیرالا میں تبدیلیوں کا ایک نیا سلسلہ لے آئی ہیں۔ دفاعی ماہرین کئی برسوں سے خبردار کرتے آ رہے تھے کہ خلیج فارس کی طرف نقل مکانی کرنے والے شدّت پسند نظریات لے کر وطن لوٹ رہے تھے۔ خطرے سے ہوشیار کرنے والی گھنٹی اکتوبر 2008 میں اس وقت بجنی شروع ہوئی جب نوجوان ملایالیز انڈیا کی دفاعی قوتوں کے ہاتھوں اس وقت موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے جب وہ مبینہ طور پر کشمیر کے جہادی ٹریننگ کیمپ میں سرگرم دیکھے گئے تھے۔ گزشتہ جولائی میں ایک اور مختلف نوعیت کا خطرہ اس وقت سامنے آیا جب نوجوان مسلمانوں کے ایک گروہ نے ایک عیسائی پروفیسر کے ہاتھ اس بناء پر کاٹ دیئے تھے کہ اس نے ایک امتحانی پرچے میں اس طرح کا سوال بنایا تھا جس سے پیغمبر اسلام حضرت محمد ؐ کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔

بنیاد پرستی کے یہ جزیرے ایک ایسی سرزمین پر کیسے ابھر آئے جو کسی زمانے میں رواداری اور خوش حالی کا مثالی نمونہ تھی، اس کا جواب پانے کے لئے میں نے کیرالا کی مسلمان آبادی کے دل مالابار کے اندر مختلف جگہوں کا سفر کرتے ہوئے مذہبی قدامت پسندوں، سیاسی کارکنوں، اور جہادی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام کا سامنا کرنے والوں کے اہل خانہ

کے انٹرویو کیئے۔ انتہاء پسند، یقیناً اقلیت میں ہیں، مگر ان کے نظریات جڑیں پکڑ چکے ہیں جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ کیرالا کی معاشی اور سماجی ترقی کی معجزے کی ثمرات سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہے۔

اشتعال کے راستے

کیرالا کے ساحل کے ساتھ ساتھ کالی کٹ (اب کوزہی کوڈے) سے کنّور جاتے ہوئے شمال کی جانب آگے بڑھیں تو آپ کو سڑکوں پر ایسے اشتہاری بورڈوں کی بھرمار نظر آئے گی جن سے سونے کے زیورات اور ریشمی ساڑھیوں کی تشہیر کی گئی ہے اور اس کے علاوہ مستری مزدور جا بجا مکانات کی تعمیر کرتے نظر آئیں گے۔ یہ سب خلیج سے آنے والی دولت کی واضح نشانیاں ہیں۔ کنّور وہ جگہ ہے جہاں سے ان چار افراد نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا جو کشمیر میں مارے گئے تھے۔ بھارتی حکام کا کہنا ہے کہ مارے جانے سے قبل انہوں نے کیرالا میں بذریعہ فون دس مرتبہ رابطہ کیا تھا۔ ایک برس کی تحقیقات کے نتیجے میں جن کا آغاز ان فون کالز سے ہوا تھا، 24 افراد پر فرد جرم عائد ہوئی تھیں پولیس کے مطابق ان چار افراد کو پاکستانی دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ نے حیدر آباد اور نیو دہلی میں محفوظ مکانات میں قیام کراتے ہوئے کشمیر پہنچایا تھا۔ پولیس کے بقول اس تنظیم کو چلانے والے اپنی سرگرمیوں کا رخ پاکستانی کشمیر میں بیٹھ کر متعین کرتے تھے اور انہیں پیسے بذریعہ عمان فراہم کئے جاتے تھے (بھارت والے ممبئی میں 2008 میں ہونے والے حملوں کا الزام بھی لشکر طیبہ کے سر پر ڈالتے ہیں)۔

لشکرِ طیبہ اور کیرالا کے درمیان مبیّنہ ربط تھد یانیو ید انصیر نامی ایک آدمی کے ذریعے قائم ہوا تھا۔ 2006 میں نصیر کی ملاقات عمان میں کام کرنے والے ملائی سرفراز نواز سے ہوئی جو کیرالا اپنے وطن جا رہا تھا۔ حکام کے مطابق نواز جسے عمان کی حکومت نے بھارت کے حوالے کر دیا تھا لشکر طیبہ کا متحرک کارکن ہے۔ تاروں کے تبادلے اور دوسرے روابط کی چھان بین کی بنیاد پر پولیس نے الزام عائد کیا ہے کہ نصیر عالمی جہادی سرگرمیوں کے لئے کیرالا سے لوگوں کی بھرتی کرتا ہے۔ نصیر کے بھائی سہیل کے مطابق ''نصیر خود کو بے گناہ تصور کرتا ہے''۔ اس نے مزید بتایا کہ ''وہ خوفزدہ نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی آخرت بہتر بنانا چاہتا ہے''۔

سہیل نصیر کی داستان اپنے اس خاندانی مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر سنا رہا ہے جو اس کے باپ نے ابوظہبی کی ایک بیکری میں 20 برس تک کام کر کے حاصل ہونے والی رقم سے بنائی تھی۔ نصیر دینی مدرّس بننے کی خواہش رکھتا تھا مگر اس کے والد نے اصرار کیا تھا کہ وہ کوئی ہنر سیکھ لے، چنانچہ نصیر نے دو برس تک سعودی عرب میں ایک ایئر کنڈیشنز مکینک کا کام کیا۔ وہ 2002 میں وطن واپس آنے سے پہلے وقتاً فوقتاً پیسے بھجواتا رہتا تھا اور لوٹ آنے تک کچھ حد تک تبدیل بھی ہو چکا تھا۔ ''پہلے اس کے تمام دوست ہماری طرح کے لوگ ہی تھے۔ ان میں سے بعض پیتے پلاتے اور اچھا وقت گزارتے تھے''، سہیل نے بتایا۔ مگر واپسی پر نصیر کے دوست بالکل تبدیل ہو چکے تھے۔ ''ہمیں بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھے''۔ کنّور واپس آ کر نصیر نے ایک پینٹر کے طور کام شروع کر دیا۔ بعض اوقات وہ ہفتوں گھر سے دور رہتا۔ اس کے والد نے اصرار کیا کہ ''وہ واپس سعودی عرب کیوں نہیں چلا جاتا؟'' ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور نصیر گھر سے دور چلا گیا۔ دوری اور لاتعلقی کے ان دنوں میں نصیر نے نوریشیا طریقت نامی ایک تنظیم کے لئے مذہبی کلاسوں کا اہتمام شروع کر دیا۔ تفتیشی اداروں کے مطابق یہ جہادیوں کی بھرتی کے لئے ایک آڑ تھی، مگر کنّور میں اس کی شہرت ایک ایسی تنظیم کی تھی جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو دنیا کی خواہشوں اور دولت کی تمنا سے آزاد کرنے کا کام کرتی تھی۔ 10 ستمبر 2008 کی ایک صبح صفیہ محمد کا 22 سالہ بیٹا فیاض حیدر آباد میں واقع اس کے ایک مرکز کی طرف روانہ ہو گیا۔ فیاض کبھی بھی برسر روزگار نہیں تھا، اور صفیہ کو امید تھی کہ اس بار وہ کسی بہتر راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ ''میں نے اسے بتایا تھا کہ اگر تم نے خود کو کسی غلط کام میں ملوث کر لیا تو پھر واپسی کی کوئی گنجائش نہیں''۔ وہ تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔ فیاض چند ہفتوں کے بعد کشمیر میں مارا گیا۔

یہ اموات واقع ہونے کے بعد نصیر سرحد پار کر کے بنگلہ دیش چلا گیا۔ وہاں سے اسے بھارتی حکام کے حوالے کر دیا اور اب وہ 2009 کے وسط سے ان کی تحویل میں ہی ہے۔ پولیس نے اس پر جو الزامات عائد کئے ہیں ان کے مطابق وہ 2005 میں ایک بنیاد پرست مبلغ کی رہائی کے حوالے سے احتجاج کے طور پر دو بسوں کے اغواء میں، اور 2003 کے دیہی فسادات میں ہندوؤں پر تشدد کے ملزم مسلمانوں سے ہونے والے سلوک کے ردِّعمل کے طور پر 2006 میں کوزہی کوڈے میں ہونے والے دو دھماکوں اور 2008 کے بنگلور دھماکوں میں ملوث رہا ہے۔ ''جیسا کہ بھارتی

حکام کا کہنا ہے، نصیر نے اپنے بھائی سے کہا تھا۔ ''میں نے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کیا''۔ جیسا کہ بھارتی حکام کا کہنا ہے، نصیر اور نواز خلیج میں کام کرنے والے غیر ملکی باشندوں کو جال میں پھنسانے کے طریقہء واردت کی مستند مثال ہیں۔ ''جب ایک مرتبہ وہ آپ کی مدد کردیں گے تو پھر آپ کو اپنے شکنجے میں پھنسالیں گے'' یہ الفاظ بھارت کے سیکرٹری داخلہ جی۔ کے پلاٹی نے بھارتی جریدے تہلکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہے۔ مگر یہ منطق فیاض کی طرح کے ایسے لوگوں تک ان کے اثر ورسوخ کی وضاحت کرنے میں ناکام رہتی ہے جو کبھی کیرالا سے باہر ہی نہیں گئے۔

ملایالیز کو وطن کے اندر بھی شدت پسندی کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ بھارت کے پاپولر فرنٹ کی مثال ہی لے لیں۔ اس کے ترجمان پی کویا کے مطابق یہ ایک عالمگیریت مخالف، نو آزاد نظریات مخالف، اور غریب مسلمان حمایت تحریک ہے۔ فرنٹ میں اوسطاً 20 برس کی عمر کے 50,000 ارکان شامل ہیں، کویا نے بتایا۔ یہ ان میں سے ہی کچھ لوگ تھے جنھوں نے ایک یونیورسٹی پروفیسر کے ہاتھ کاٹ دیئے تھے۔ کویا انگریزی کا ریٹائرڈ پروفیسر ہے اور اس کی لائبریری میں قرآن کے ساتھ ہی جیمز جوائس کی کتابیں بھی مل جائیں گی۔ اس کا کہنا ہے کہ مجرموں کو معطل کردیا گیا ہے: ''ہماری یہ پالیسی نہیں ہے کہ نگرانی کا کام کرنے والی تنظیم بن کر رہ جائیں''۔ تاہم وہ ان کے اشتعال انگیز جذبات کو نہیں جھٹلاتا۔ کیرالا میں نظریات کی آزادی کی روایت کی بنا پر تاجروں، مبلغوں، تارکین وطن اور دوسرے جنگجوؤں کے ساتھ ساتھ ان نوجوان شدت پسندوں کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ تاہم یہ واضح نہیں ہے کہ آیا کالی کٹ کی بندرگاہ ابھی بھی اتنی وسیع ہے کہ ان سب کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔

☆☆☆☆☆

سپین میں شناخت کا بحران

لیزا ابینڈ۔غرناطہ

گزشتہ 24 برس سے معوز انٹونیو گونزالیز کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ جون میں صبح سویرے اٹھتا ہے اور اپنی پلکوں کے عقب کی جھریوں کو سیاہ آرائشی لکیروں کے ذریعے غیر واضح کر دیتا ہے۔ آکسفورڈ شرٹ اور استری کی ہوئی پینٹ کی بجائے یہ 45 سالہ اکاؤنٹنٹ عموماً ساٹن کی ڈھیلی سی قمیض اور جھلملاتی ہوئی پتلون پہنتا ہے۔ اور پھر اپنی کمر سے ایک بنام لٹکا کر اور سر پر پگڑی رکھ کے جنوبی کیبن کے شر موھا کار میں سینکڑوں مخلوط (بربر و عرب نسل کے) مور مسلمانوں کے ساتھ جا ملتا ہے جہاں وہ عیسائیوں کے خلاف اپنی آخری مدافعت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی سلطنت کی شاید ہی کوئی اور ایسی نشانی باقی رہ گئی ہو جسے ابن بطوطہ الاندلس کے طور پر جانتا ہو ماسوائے مور مسلمانوں اور عیسائیوں کے اس تہوار کے جو سپین کے سارے شہروں میں منایا جاتا ہے، جس میں ساری کی ساری آبادی بڑے نمایاں قسم کے فوجی دستوں والا لباس زیب تن کئے قرون وسطیٰ کے آخری مسلمان حکمرانوں کی طرف سے فاتح کیتھولک بادشاہوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کی رسم دہراتی ہے۔ تاہم صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کا تہوار ہی مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور کی نشانی نہیں ہے۔ فن تعمیر سے لے کر کھانوں کے ذوق اور ایک مشترکہ ذخیرہ الفاظ بشمول ہر جگہ موجود ojala یعنی اللہ کا دور کا رشتہ دار، تک اس ملک کے اسلامی ماضی کی جڑیں اس کے حال میں پیوست ہیں۔ یہ وہ خصوصیت تھی جس کی تردید صدیوں سے کی

جا رہی تھی۔ تقریباً ایک شرمناک شناخت جس کو سامنے رکھ کر ''اصل'' (یعنی کیتھولک) ہسپانویوں نے اپنی پہچان کروائی۔

آج کے سپین میں پرانی تہذیب کی وہ شاندار یادگاریں، مادی یا علامتی، جو کہ کسی زمانے نے میں اندلس کہلاتی تھیں اس سیاحوں کی کشش کے طور پر ہی قائم رہ گئی ہیں اور اس سے بھی اہم طور پر اب نئے سپین کی نمائندہ کثیر ثقافتی زندگی کے جزو کے طور پر۔ تاہم سپین کا اصل مسلمانوں کے ساتھ تعلق زیادہ پیچیدہ نوعیت کا ہے۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو یورپی سبزیوں کا انتخاب کرتے ہیں، اسکول کھولتے اور کاروبار چلاتے ہیں اور مسجدیں تعمیر کرتے ہیں۔

نقل مکانی اسپین میں برطانیہ، فرانس یا جرمنی کے بعد شروع ہوئی: بے شک سپین میں زیادہ تر مسلمان پہلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں نے، خاص طور پر مراکش سے، اس وقت زیادہ تعداد میں نقل مکانی شروع کر دی تھی جب اسپین کی معیشت یورپی یونین میں شمولیت کے بعد اوپر جانا شروع ہوگئی۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق اسپین میں 15 لاکھ مسلمان ہیں، اور وہ ایک ایسی ثقافت میں ہمیشہ آسانی سے ضم نہیں ہو سکتے جو کہ قدامت پسند، اور متجانس نظر آنے کے علاوہ بہت زیادہ کیتھولک بھی ہے۔ للیڈا کا شہر، کٹالونیا کے صوبے کے بہت سے اور شہروں کی طرح، پہلے سے ہی پردے کی ممانعت کی طرف چل پڑا ہے۔ اور 22 کو ہونے والے مقامی انتخابات میں، نقل مکانی کی مخالف جماعتوں نے علاقائی اور بلدیاتی دونوں سطحوں پر نشستیں جیت لی ہیں۔ آج کے سپین میں ایک تصوراتی ماضی ہمیشہ ایک متصادم حال کے ساتھ ملاپ کرتا نظر آتا ہے۔

واپس مستقبل کی طرف

آپ شروع میں قرطبہ سے آغاز کر سکتے ہیں جو کہ مور مسلمانوں کی جائے خلافت ہے۔ 756 میں جب عبدالرحمٰن اول برسر اقتدار آیا تو اس نے اس شہر کو جنت ارضی کے تصور میں تبدیل کر دیا۔ بعد کے عشروں میں قرطبہ کے شاعر رومانوی محبت کی تعریف میں نہایت دلفریب نغمے لکھتے، اس کے ماہر نجوم یا ستارہ شناس جنت کا سراغ پہلے سے کہیں زیادہ درستگی کے ساتھ لگاتے جبکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ قریبی پائپوں میں سے گندہ پانی باہر نکل رہا ہوتا۔ تاہم اموی حکمرانوں کی

تمام کامیابیوں میں سے کوئی بھی اس قدر خیرہ کن نہیں تھی جتنی کہ مزکیتا یعنی وہ حیرت انگیز مسجد جو کہ وزی گوتھ چرچ (جو اس سے قبل لا دینوں کا معبد ہوتا تھا) کے آثار پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے 24000 مربع میٹر رقبے پر مشتمل عمارت میں سے 800 دھاری دار محرابیں اس طرح گزاری گئی ہیں کہ دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے جیسے سرخ وسفید رنگوں کا نہ ختم ہونے والا جنگل ہو۔ سولہویں صدی کی تسخیر نو کی کامیابی کے بعد ہابسرگ سلطنت کے شہنشاہ چارلس پنجم نے مزکیتا کی وسطی محرابیں تڑوا کران کی جگہ گرجے میں مرکزی مقام پر لگایا جانے والا بھاری تراشیدہ (سفینہ نما) پتھر لگا دیا جو کہ عمارت کی نئی حیثیت یعنی بطور قرطبہ کیتھڈرل کے لئے موزوں تھا اور یہ حیثیت اب تک قائم چلی آ رہی ہے۔

کیتھڈرل پہنچنے کے لئے دمیتر یو فرنانڈیز بشپ پیلس کے مورش طرز کے آنگن (patio) سے گزر کر جاتا ہے۔ وہ ایک مضبوط اور لمبے جثّہ کا آدمی ہے، مگر اس کے انداز سے اس وقت ایک وقار سا جھلکتا ہے جب وہ ہماری لیڈی فاطمہ کے آرائشی جھالروں والے ہاتھ اور ریستورانوں میں پیش کئے جانے والا سوپ بیچنے والوں کے پاس سے ہوتا ہوا گزرتا ہے، پھر سنگترے کے ان باغوں کے نیچے چلتا ہے جو ایک ہزار سے زیادہ عرصہ قبل تعمیر کی گئی نہروں سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہ سارا عمل اس کے اسلامی طرز کے چھتے دار راستوں سے گزرنے سے قبل ہی پایہ تکمیل تک جا پہنچتا ہے۔ اور اس کے باوجود قرطبہ کا پادری اس ساخت کے مفہوم کے حوالے سے کسی طرح کی جذباتی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ ''مسلمانوں کو وہاں عبادت کی اجازت کیوں دینی چاہیئے؟'' فرنانڈیز سوال کرتا ہے۔ ''اصل سوال یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بات کیوں عجیب لگتی ہے کہ انہیں اجازت نہیں ہونی چاہیئے؟ یہ کیتھڈرل ہے''۔

وہ ایک ایسی مہم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو زیادہ تر بعد اسلام قبول کرنے والے ہسپانوی لوگوں کی تنظیم جنتا اسلامیکا کی طرف سے ایک برس قبل شروع کی گئی تھی۔ یہ دلیل دیتے ہوئے کہ مزا کیتا اپنی چمکتی ہوئی محراب اور بڑی نفاست سے تراشے گئے گوتھک ٹائلوں والے سٹالز کے ساتھ سماجی توازن کی ایک اہم مثال کا مقصد ایک ایسے دور میں پورا کر سکتی ہے جو ثقافتی اختلافات سے بھرپور دور ہے، جنتا اسلامیکا نے یہ درخواست کی ہے کہ اسے مسلمانوں کی عبادت کے لئے کھولا جائے۔ قرطبہ کے پادری نے انکار کر دیا۔ جب 2010 میں آسٹریا سے آنے والے

120 مسلمانوں نے اس عمارت میں داخل ہو کر عبادت کرنی شروع کر دی تو مزکیتا کے محافظوں نے انہیں نکالنے کے لئے پیش قدمی کی اور یوں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔

ابھی حال ہی میں فرنانڈیز نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس عمارت کو مزکیتا کی بجائے کیتھڈرل کا نام دیا جانا چاہئے اور بلدیاتی اداروں سے درخواست کی ہے کہ سڑکوں اور گلیوں میں اس عمارت کی سمت کی نشاندہی کرنے والے بورڈ بھی اس نئے نام کے ساتھ لگائے جائیں۔ جنتا کے ترجمان ازابیل رومیو نے اس تجویز کی مخالفت کی ہے: ''تاریخ کو مٹانے کی کوشش بہت بڑی غلطی ہے''۔ بشپ فرنانڈیز بھی ویسا ہی حربہ استعمال کرتا ہے یہ نکتہ عیاں کرتے ہوئے کہ یہ عمارت مسجد سے پہلے وزی گوتھ چرچ ہوتی تھی، اور یہ کہ قسطنطنیہ سے بلوائے گئے عیسائی ماہرین تعمیرات نے اسے مزکیتا کی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سب سے اہم یہ کہ اس کے بقول یہ گزشتہ چار صدیوں سے ایک کیتھڈرل ہی ہے: ''اسے کچھ اور کہنے کی بجائے ایک تاریخی غلطی کہنا ہی زیادہ مناسب رہے گا''۔

ماضی پر لڑائی جھگڑا یقیناً حال کے بارے میں گفتگو کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ رومیو کے نزدیک عمارت کے نام کے حوالے سے بشپ کے تفکرات کے پس پردہ اسلام کا خوف کارفرما ہے، ایک ایسا خوف جو کہ مسلمان بنیاد پرستوں کی جانب سے مارچ 2004 میں میڈرڈ میں کئے جانے والے دھماکوں کے وقت سے ہی فضا میں موجود ہے۔ فرنانڈیز نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ بحث مباحثہ یا تبادلہ خیال کا اس حوالے سے جاری رہنا ہی چرچ کی وسعت نظر کی علامت ہے۔ ''کیا سعودی عرب میں سیاسی / سماجی کارکنوں کو یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ مسجد کو عیسائی عبادات کے لئے کھولنے کا مطالبہ کریں؟'' اس نے سوال اٹھایا۔ ''یہ حقیقت کہ اسپین جیسے ملک میں جو ایک عیسائی ملک تھا اور ہے اس طرح کا مباحثہ کیا جا رہا ہے، اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ عیسائیت میں رواداری پائی جاتی ہے۔

عقیدے کا معاملہ

کیا اسپین ابھی تک بنیادی طور پر ایک عیسائی ملک ہے؟ کیتھولک چرچ سے عملی طور پر منسلک رہنے والوں کا تناسب تاریخ کی پست ترین سطح پر ہے (57.8) فیصد کا کہنا کہ انہوں نے

اتوار کی اجتماعی عبادت میں کبھی شرکت ہی نہیں کی) جبکہ مسلمانوں کے اندر مذہبی رسوم کی پیروی کی شرح بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اگرچہ اس وقت مسلمان اسپین کی آبادی کا بہت معمولی سا حصہ ہیں(چند اندازوں کے مطابق 1 تا3فی صد) تاہم جنوبی اسپین میں اندلس کے اندر ال اجیدو جیسی جگہوں پر وہ بری تیزی سے کیتھولک آبادی کو بے گھر کررہے ہیں۔

کوئی چالیس برس پہلے ال اجیدو کا بمشکل ہی کوئی وجود تھا۔مگر یہ وقت سے پہلے کی بات ہے جب المبریا کے نواحی علاقے میں کسانوں نے پلاسٹک کے عارضی پودا گھر (Green houses) قائم کئے تھے تاکہ اس جگہ کہ کم زرخیز زمین میں سارا سال سبزیاں لگاسکیں۔اب یہاں سے یورپ کو براعظم کے کسی بھی اور علاقے کی نسبت زیادہ برآمدات کی جاتی ہیں۔اور اسی وجہ سے المبریا نقل مکانی کر کے آنے والے مزدوروں کے لئے ایک اہم مرکز بن چکا ہے۔شہر کی 85000 آبادی میں سے ایک تہائی سے زیادہ تعداد نقل مکانی کر کے آنے والوں کی ہے؛ جن میں سے پورے65فی صد مراکش سے تعلق رکھتے ہیں۔

7برس قبل نادور، مراکش سے آنے والے27 سالہ عزوز دامانی کا کہنا ہے کہ ''میں یہاں اپنی زندگی کو بہتر بنانے آیا تھا''۔سپین میں پہلے 4برسوں کے دوران اس نے ایک گرین ہاؤس میں کام کیا۔وہ ایک دن10 گھنٹہ کام کر کے43ڈالر کما لیتا تھا۔اس کا کام48 سینٹی گریڈ کے اردگرد درجہء حرارت میں کالی مرچیں اور ٹماٹر چن کر اکٹھے کرنا تھا۔یہ واقعی بہت مشکل کام تھا۔اس نے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔''مگر میری خواہش ہے کہ میں یہ کام اب کر رہا ہوتا''۔وہ اسپین میں2008 سے شروع ہونے والے مالیاتی بحران کے وقت سے ہی بیروزگار ہے اور اب سرکاری وظیفے اور مختلف نوعیت کے متفرق کام کر کے گزارہ کررہا ہے۔

ال اجیدو کے ایک خستہ حال علاقے میں اپنے بنچ پر بیٹھا دامانی غصے و ناراضگی سے بھرا ہوا ہے۔اسے معلوم ہے کہ الاجیدو کے مرکز میں واقع وسیع اور سایہ دار درختوں سے گھری ہوئی شاہراہوں کی روزانہ کئی مالی اور خاکروب دیکھ بھال اور صفائی کرتے ہیں،مگر یہاں، وہ بڑے کڑوے کسیلے لہجے میں بولتے ہوئے کہتا ہے،کوئی بھی صفائی کرنے نہیں آتا،''اس جگہ کی حالت زار ملاحظہ کریں، اس شہر کی کوئی بھی دیکھ بھال نہیں کرتا۔کوئی بھی یہاں سے کوڑا نہیں اٹھاتا؛ سارے درخت مرجھا چکے ہیں''۔اسے بلدیاتی حکومت پر اس لئے غصہ آتا ہے کیونکہ اس نے ان

مسجدوں کو اجازت نامے دینے سے انکار کر دیا ہے جہاں وہ نماز پڑھتا ہے، اور اسے اندلوسیوں پر بھی بہت غصہ آتا ہے، جو بقول اسکے ''میڈرڈ کے لوگوں سے زیادہ نسل پرست ہیں''۔

گیارہ برس پہلے الاجیدو سپین کی تاریخ کے بدترین فسادات کا گڑھ تھا۔ ایک ہسپانوی عورت کو خنجر گھونپ کر قتل کرنے کے بعد مراکش کے باشندے کی گرفتاری کے واقعہ نے طویل عرصے سے قیام پذیر ان سینکڑوں تارکین وطن کو جو اس طرح کے حملوں اور معمولی نوعیت کے جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح سے پہلے ہی تنگ آ چکے تھے، جلوس کی شکل میں شہر کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا جہاں انہوں نے نسلی تعصب پر مبنی نعرہ بازی کے ساتھ ہی، مراکشی باشندوں کی جائیدادوں کو نذر آتش کر دیا اور تارکین وطن پر پتھراؤ بھی کیا۔ یہ فسادات کئی روز تک جاری رہے، تاہم اس کے باوجود نہ تو اس اشتعال انگیز مظاہرے کا نہ ہی سرحد پار کرنے کے خطرات اور نہ ہی یورپین یونین کی طرف سے اپنی سرحدوں کو محفوظ بنانے کی کوششوں کا نتیجہ نئے تارکین وطن یا نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں کمی کی صورت میں نکلا۔ اگرچہ اقتصادی بحران نے نقل مکانی کی شدت میں کمی کر دی ہے، تاہم یہ اسے روکنے میں صرف اس بناء پر ناکام رہی ہے کہ اسپین میں حالات جتنے بھی سخت ہیں مگر اس کے باوجود محنتی تارکین وطن کو وہاں اپنے ملک سے بہتر مواقع ملتے ہیں۔

فسادات کے وقت سے ہی الااجیدو میں امن بہت مشکل سے برقرار رکھا جا رہا ہے۔ بہتر حالات کار کے علاوہ سماجی خدمات کے معیار میں اضافے کے بھی مثبت نتائج نکلے ہیں۔ شہر میں سماجی خدمات کے سربراہ مینوئل اریزا کے مطابق، ''ہم نے محض ربط پیدا نہیں کیا'' بلکہ ''ہم نے آہنگی پیدا کر دی ہے''۔ ابھی بھی ایسے علاقے موجود ہیں جہاں صرف مراکشی باشندے آباد ہیں۔ باوجود اس کے کہ بلدیاتی محکموں کی طرف سے مخلوط رہائش والے علاقوں کا رجحان فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہت کم مسلمان تارکین وطن ایسے ہیں جنہوں نے مقامی ہسپانویوں سے شادی کی ہے۔ اور الااجیدو کے کچھ اسکول ایسے ہیں جو رضا کارانہ طور پر علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم ہیں۔ اریزا کی رائے میں ''ہم نے یہ سیکھ لیا ہے کہ آپ سطحی عوامل، مثلاً پالیسیوں، اقتصادی مواقع وغیرہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، مگر ''بنیادی اہمیت کے عوامل، مثلاً مذہبی اور خاندانی اقدار وغیرہ کو تبدیل کرنا بہت ہی مشکل ہے''۔ ''یہ جذبات ہی ہیں جن سے دامانی جبلی طور پر اتفاق کرتا ہے۔ جب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ آیا کہ وہ اپنے نئے وطن کے حوالے سے

شناخت کا تصور کر سکتا ہے تو وہ نفی کے انداز میں اپنا سر ہلا دیتا ہے۔ ''نہیں، یہ ممکن نہیں ہے''، وہ گویا ہوتا ہے۔ ''میرا یہ خیال نہیں ہے کہ میں خود کو کبھی ہسپانوی تصور کروں گا''۔

عقائد کا ملاپ

غرناطہ میں الحمرا سیلون آف کنگز کی آرائشی لپائی کا کام کرتے ہوئے رامن روبیو اسلام کے ساتھ قریبی ربط کا احساس ظاہر کرتا ہے۔ تیرھویں صدی کے قریب تعمیر کردہ الحمراء کسی زمانے میں سپین کے آخری مسلمان حکمران خاندان، کا محل ہوتا تھا۔ آج کل یہاں ہر سال 30 لاکھ کے قریب سیاح آتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کا شمار سپین کے سب سے پرکشش مقام میں ہوتا ہے کوئی برسوں سے یہاں بے شمار سیاحوں کی آمد ورفت کی وجہ سے عمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہے اور اب اس کی بحالی کا کام بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ روبیو، جو کہ الحمراء کی ٹائل اینڈ پلاسٹر ورکشاپس کا ڈائریکٹر ہے، اپنے دن چھتوں کے قریب ان رنگین گنبدوں کے بڑی باریک بینی سے آرائش ومرمت میں گزارتا نظر آتا ہے جنہیں نذاری دستکاروں نے بہت باریک قسم کے نمونوں سے مزّین کیا تھا۔ ہاتھ سے لاجوردی رنگ کے نقش ونگار بناتے ہوئے، اگرچہ کوئی انہیں زمین پر کھڑا ہو کے دیکھنے کی زحمت ہی نہ کرتا ہوگا۔ ''یہاں کام کرتے ہوئے آپ ان کے ساتھ ایک ربط سا محسوس کرتے ہیں، اگرچہ یہ سات صدی پہلے کے ہیں''۔ وہ گویا ہوتا ہے۔ ''میں عرب باشندہ نہیں ہوں مگر میں گریناڈینو ہوں۔ چنانچہ اس سے میرا تعلق بنتا ہے''۔

الحمراء سے نکلنے والے دریا کے پار ایک اور پہاڑی پر ایک اور اسلامی عمارت بن گئی ہے۔ یہ ایک ایسی چمکتی ہوئی سفید مسجد ہے جو 500 برسوں میں غرناطہ کی پہلی بامقصد تعمیر ہے۔ اس کی تعمیر میں 22 برس سے زیادہ عرصہ لگ گیا تھا اور تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ علاقے کے بہت سے رہائیشیوں کو یہ فکر تھی کہ مقامی مسلمانوں اور اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے والے ملک متحدہ عرب امارات، دونوں کی کوشش یہ تھی کہ ''اندلس کی شان وشوکت بحال کی جائے''۔ تاہم اپنے افتتاح کے آٹھ برسوں کے بعد یہ نئی مسجد غرناطہ کے پرانے مورش علاقے البسین کے قدرتی وخوبصورت مناظر کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس کے پھولوں سے بھرے آنگن میں سیاحوں کی بھرمار ہوتی ہے جو وہاں سے دوسرے سمت میں واقع الحمراء کا ایک بہتر نظارہ کرنا چاہتے ہیں، جبکہ عبادت گزار خود اپنے لئے وقف

دروازوں سے داخل ہوتے ہیں جو کہ صنف کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

اس مسجد کی تعمیر اور ابھی تک اس کی دیکھ بھال کرنے والے مسلمان وہ ہسپانوی ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اصل میں سکاٹ لینڈ سے مسلمان ہو کر 1975 میں اس وقت غرناطہ آئے جب آمر فرانسکو فرانکو مرنے کے قریب تھا اور اس نے سپین میں اس اسلام کو دوبارہ متعارف کروانا شروع کر دیا تھا۔ جو پہلے اس کے جبر کا شکار رہا تھا۔ آج اسپین میں بمشکل بیس ہزار لوگ ایسے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اگرچہ مسلمان ہو جانے کے بعد وہ مختلف نظریاتی گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے، مگر اندلس کی اہمیت نے ایک قابل تقلید مثال کے طور پر نہ کہ از سر نو تسخیر کردہ سرزمین کے طور پر ان کو متحد رکھا ہوا ہے۔ اسلام قبول کر لینے والا مہدی فلورز لکھتا ہے کہ ''ہم خود کو ایک ایسے سماجی و ثقافتی گروہ کا رکن تصور کرتے ہیں جس نے دنیا کو ایک ایسی خوبصورت ترین تہذیب سے روشناس کرایا جس کی نظیر بہت کم ہی ملتی ہے''۔ وہ مزید رقمطراز ہوتا ہے کہ ''ایک ایسی تہذہب جو اپنے اجالوں اور اندھیروں کے ساتھ انسانیت کے ایک ایسے درجے تک پہنچ گئی جو آج بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے ایک مثالی زندگی کی جستجو کے سفر میں ہماری رہنمائی کرتی ہے''۔

غرناطہ میں اسلام قبول کرنے والے طبقے نے جلد ہی پیدائشی مقامی مسلمانوں کو بھی اپنی طرف راغب کر لیا۔ 30 برس قبل اسلام قبول کرنے والے ایک اسکول ٹیچر زکریا ز ماذا کے مطابق ''ہم نے یہاں سے اس لئے آغاز کیا کیونکہ غرناطہ کے علامتی طور پر زیادہ نمایاں ہونے کے ساتھ ہی اندلوسی ثقافت کا رنگ بھی تازگی کا احساس لئے ہوئے تھا''۔ وہ مزید کہتا ہے کہ ''مگر اس کے بعد شمالی افریقہ کے ساحلوں سے نقل مکانی کرنے والوں نے یہاں کا رخ کرنا شروع کر دیا کیونکہ انکے علم میں آ گیا تھا کہ یہاں پر مسلمان موجود ہیں، اور پھر یہاں پر مسجد بھی موجود تھی''۔ آج یہاں تین مسجدیں ہیں جن میں سے ایک پہاڑی کے اوپر بنی ہوئی نئی مسجد بھی شامل ہے۔ ماذا ابھی تک پہلے والی مسجد میں ہی عبادت کرتا ہے جو کہ شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المنز لہ عمارت کے اندر واقع ہے (اس پر تحریر کردہ ایک عبارت عبادت گزاروں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ مسجد کے اوپر والی منزل میں رہائش پذیر عیسائی خاندان کا سکون خراب کرنے سے احتراز کریں)۔ ''اوپر والی زیادہ تر ہسپانوی، اور ممکنہ طور پر زیادہ آزادانہ ماحول کی حامل ہے'' اور میرے والی، جو نیچے

ہے، ملے جلے ماحول کی آئینہ دار ہے''۔ اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

سپین میں غرناطہ کی مسلم آبادی کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کی واحد علامت محض مذہبی تنوع ہی نہیں ہے۔ یہاں ایک عدد یورو عرب مینجمنٹ اسکول بھی ہے؛ ملک کی ''اسلامی نظریات سے متاثر'' پہلی سیاسی جماعت دی پارٹی آف سپینیس رہنے سنس اینڈ یونٹی کی بنیاد بھی 2009 میں یہیں رکھی گئی تھی۔ اور پھر پلازہ نوایوا کے عقب میں ڈھلواں گلیاں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کا کاروبار ہے۔

ایک منتشر قوم

ان دنوں اندلس کے اندر سفر کرتے ہوئے گزرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی مخصوص قسم کے ذہنی جنون کا سامنا کر رہے ہوں۔ اسلامی تاریخ کی عکاسی خلافت کے دور کی ان یادگار عمارتوں سے ہوتی ہے جن کی شان وشوکت بھال کی جا چکی ہے، تمام بڑے شہروں میں موجود ان بستیوں سے ہوتی ہے جو چائے خانوں اور عرب ''حماموں'' میں تبدیل ہو چکی ہیں، اور اندلس کے ایک ایسے رومانوی تصور سے ہوتی ہے جس کے مطابق مسلمانوں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہتے تھے۔ ان سب کو نہ صرف خوشی خوشی قبول کیا جاتا ہے بلکہ معاشرے کے لئے ایک مثال سمجھا جاتا ہے۔ مگر آج کے دور کا اسلام جو یا تو خود اپنا کاروبار شروع کرتے ہیں یا پھر عارضی قسم کی رہائش گاہوں میں تنگ ہو کر رہتے ہیں؛ ان عورتوں کے اسلام جو نقاب تو پہنتی ہیں مگر دیو داساں نہیں ہیں؛ صوفیانہ اسرار ومستی سے لے کر سلافی کٹر پسندی تک مختلف فرقوں میں بٹا ہوا اسلام، وہ جیتا جاگتا اسلام ہے جو ابھی تک باقی ماندہ معاشرے میں جذب نہیں ہوا بلکہ اپنی جداگانہ شناخت رکھتا ہے۔

موجا کار میں جوزا انٹیو گونزالیز مذاق کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس نے مور مسلمان کو عیسائیوں پر اس لئے ترجیح دی کہ ان کے ملبوسات بہتر تھے۔ تاہم وہ ایک زیادہ سنجیدہ نوعیت ک ے ربط کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ ''میں عرب ثقافت کا بہت زبردست حامی ہوں''، وہ کہتا ہے۔ ''ہمیں اندلس نے جو کچھ دیا وہ روشنی کا ایک ایسا مینار تھا جس نے پوری دنیا کو منور کر کے رکھ دیا''۔ تاہم وہ ابھی تک ان کوششوں کے حق میں نہیں ہے کہ قرطبہ کے میز کیتا کو مسلمانوں کے

لئے کھول دیا جائے، اور کسی بھی اور شخص کی طرح وہ بھی اس طرح کی بے حسی کی شکایات پر پریشان تھا جس کے نتیجے میں کسی اور شہر میں اس کی اپنی ہ موروز کرسچانوز تقریبات سے محمد ١ کے مجسمے کو ہٹا دیا گیا تھا۔ ''میں ان سب چیزوں کو پسند کرتا ہوں جو عرب ثقافت نے ہمیں خلوص نیت سے ہمیں دی ہیں۔ مگر اب وہ کس طرح کی روایات ہم پر نافذ کر رہے ہیں؟ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔

اس کی ایک ہمسائی کچینا گداف نے بھی اسی طرح کے پیچیدہ متوازن نکتہ ءنظر کا اظہار کیا ہے۔ آدھی مصری اور آدھی مراکشن اور عملی مسلمان عورت کے طور پر وہ اور اس کا خاوند ایک برس سے ذرا پہلے سپین پہنچے تھے، اور حال ہی میں انہوں نے موجار کار میں ایک زیورات کی دوکان کھولی تھی۔ اس نے موروز کرسچانوز تقریبات میں کبھی شرکت نہیں کی، تاہم اس نے عظیم الشان مظاہرے کے بارے میں سنا ضرور ہے اور ان تقریبات میں شرکت کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے۔ ''اوہاں میری ہمسائی نے وعدہ کیا کہ وہ اس تقریب کا لباس چننے میں میری مدد کرے گی''۔ وہ جذبات سے لبریز ہو کر کہتی ہے۔ ''میں ان عیسائیوں میں سے ایک ہوں گی۔

بھارتی مسلمانوں کا بحران

ایرین بیکر

جسم کا ساتھ چھوڑتی آوازیں غصے کی لرزش تھی۔ ممبئی کے اوبرائے ٹرائیڈنٹ ہوٹل میں روپوش، جہاں کوئی چالیس کے قریب لوگوں کو یرغمال بنالیا گیا تھا، ایک مسلح محافظ نے ایک بھارتی نیوز چینل کو بتایا کہ یہ حملے بھارت میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا انتقام تھے۔ ''ہم ایک ملک کے طور پر اس سے محبت کرتے ہیں، مگر جب ہماری ماؤں بہنوں کو مارا جارہا تھا تو اس وقت سب کہاں تھے؟'' اس نے ٹیلی فون پر سوال کیا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تاہم اسے غالباً ایسے کسی جواب کی توقع ہی نہیں تھی۔

مسلمانوں کے اشتعال کی جڑیں بھارت میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن کو طویل عرصے سے روا رکھی جانے والی ان ناانصافیوں نے پروان چڑھایا ہے جو بہت سے بھارتی مسلمانوں کے یقین کے مطابق ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے خلاف منظم امتیازی مہم کا حصہ ہیں۔ آزادی کے بعد 13.4 فی صد مسلمانوں اور 80 فی صد کے قریب ہندوؤں کے مابین عدم مساوات انتہائی نمایاں ہے۔ یقیناً چند ایک استثنا بھی موجود ہیں، مگر عمومی حقائق کے مطابق، بھارتی مسلمان کی اوسط عمر کم، صحت کا معیار خراب، خواندگی کی شرح کم اور ملازمت میں تنخواہ بھی کم ہوتی ہے۔ اس تلخ لہجے میں 2002 میں گجرات میں ہونے والے مسلم کشی فسادات کا طویل پکڑتا ہوا اشتعال بھی شامل کردیں تو صورتحال اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ ہندو قوم پرستوں کے بھڑکائے

ہوئے ان فسادات میں کوئی 2000 کے قریب افراد مارے گئے تھے جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ابھی تک بہت کم مجرموں کو سزا دی گئی ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان یہ بڑھتا ہوا تفاوت انڈیا، اور ہمسایہ ملک پاکستان ، دونوں کے امن اور خوشحالی کی طرف سفیر کی راہ میں رکاوٹ بنا رہے گا۔ تاہم ہندو۔ مسلم تعلقات کے بہتری کی راہ پر گامزن ہونے سے قبل بڑے بڑے مسائل حل کرنے کی اشد ضرورت ہے: برصغیر کی طرز کے اسلام اور جدید دور کے انڈیا اور پاکستان میں مذہب کے مقام اور کردار کے مابین خلاء یا اختلاف۔ یہ بحران 150 برسوں سے لاوے کی طرح پکتا چلا آ رہا ہے۔

مسئلے کی ابتداء

29 مارچ 1857 کی سہ پہر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقامی رجمنٹ کے ایک خوبرو نوجوان سپاہی منگل پانڈے نے اپنے برطانوی لیفٹیننٹ پر حملہ کر دیا۔ ایک ہفتہ بعد اس کی پھانسی کے نتیجے میں جو بغاوت پھوٹ پڑی تھی وہ برطانویوں کے لئے سپاہی میوٹنی کے نام سے مصروف ہے۔ انتقامی کاروائی تیز تھی اور اگرچہ پانڈے ایک ہندو تھا، مگر یہ برصغیر کے مسلمان ہی تھے، جن کا مغل بادشاہ دہلی میں رسمی طور پر برسر اقتدار تھا، کہ جنہیں برطانوی اشتعال کا نشانہ بننا پڑا۔ مغلیہ سلطنت کے بچے کھچے آثار تہس نہس کر دیئے گئے اور برصغیر پر 500 سالہ مسلمان غلبے کا دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

انڈیا میں مسلمان معاشرہ زوال پذیر ہو گیا۔ برطانوی حکمرانوں نے انگریزی کو سرکاری زبان کے پر نافذ کر دیا۔ اس کے اثرات انتہائی مہلک اور ضرر رساں تھے۔ مسلمانوں کی شرح خواندگی تقریباً سو فیصد سے کم ہو کر نصف صدی کے اندر اندر تقریباً 20 فی صد تک گر گئی۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کو بڑے موثر طریقے سے سرکاری انتظامی ملازمتوں سے دور کر دیا گیا۔ 1858 سے لے کر 1878 تک کلکتہ یونیورسٹی کے جو کہ اس زمانے میں صرف 57 مسلمان تھے۔ جبکہ ہندوؤں اور برطانوی حکومت کی امتیازی پالیسیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ سارے کا سارا مسلمان معاشرہ جیسے اپنے اجتماعی زخم چاٹنے پر مجبور ہو چکا ہے۔

اس طرح خود شناسی یا خود آگہی کے دور کے بطن سے اسلام کے عروج کے لئے دو

متحارب تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں، بحالی یا احیائے دین کے لیے سرگرم گروہ کا کہنا تھا کہ اسلامی سلطنت کے زوال کا ذمہ دار ایک ایسا معاشرہ تھا جو قرآن کی تعلیمات سے بھٹک کر بہت دور نکل گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے خالص دین کی بحالی کا تصور پیش کیا جس میں نبی کریم ﷺ کی زندگی ایک بہترین نمونہ تھی۔ دوسرے طبقے نے اپنے نئے حکمرانوں کے جدید اطوار اپناتے ہوئے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اسی صورت میں آگے بڑھ سکتے ہیں اگر وہ خود کو مغربی علوم، ثقافت اور قانون سے روشناس کرائیں۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں دو عظیم اسلامی اداروں نے جنم لیا: شمالی بھارت میں دارالعلوم دیوبند، جس کی ہم پلہ قاہرہ میں اسلامی تعلیمات کی مانی ہوئی لازہر یونیورسٹی ہی تھی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو کہ دنیاوی تعلیمات، مثلاً ثقافت، فلسفہ اور لسانیات کے فروغ کے لئے کوشاں تھی مگر مذہب اس کے نزدیک مسجد تک ہی محدود رہنا چاہیے تھا۔ یہ دو مکاتب فکر اس بنیادی اختلاف کی تجسیم بنے جو آج بھی برصغیر میں اسلام کی تقسیم کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ ''یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیوبند اور علی گڑھ خاوند اور بیوی کی طرح ہیں جو کہ یکساں تاریخی واقعات کی پیداوار ہیں''، دیوبند کے ترجمان عادل صدیقی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں''۔

دیوبند میں واقع کیمپس نوئیڈا کے جدید اور وسیع مضافاتی علاقے سے ہوتے ہوئے نیو دہلی سے صرف تین گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ دو کانوں کی لمبی اور طویل قطاروں اور بڑی بڑی عمارتوں میں قائم کاروباری مراکز نے آم کے ان باغات کو نگل لیا ہے جو کسی زمانے میں دیوبند جانے والی سڑک کا احاطہ کئے ہوئے تھے، مگر آج کی جدید دنیا کا اختتام اس کے گیٹ پر ہی ہو جاتا ہے۔ دیوبند کے احاطوں میں آپ کو لمبے کالروں والی قمیضوں میں ملبوس اور سفید پگڑیوں کو سر پر جمائے داڑھی والے نوجوان ہر طرف چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ہوا میں ان سینکڑوں طالب علموں کی آوازوں کا ارتعاش پھیلا ہوتا ہے جو کھلے دروازوں والے کمروں میں قرآن مجید پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

1866 میں بنیاد پانے کے بعد دیوبند اسکول نے جلد ہی ایسے تمام روایتی مدارس سے ایک منفرد مقام حاصل کر لیا جو عام طور پر گاؤں کی مسجد کے مولوی کے گھر قائم کئے جاتے تھے۔ دہلی سے تعلق رکھنے والے مسلمان علماء پر مشتمل دیوبند کے بانیوں نے جماعت کے کمروں، نصابی کتب اور

امتحان وغیرہ کا ایک درجہ بند طریقہ یا نظام متعارف کروایا۔ تدریس اردو، فارسی اور عربی میں کی جاتی ہے اور نصاب 18ویں صدی کے بھارتی اسلامی عالم ملاّ نظام الدین سہالوی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل طالب علم قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں یا پھر سعودی عرب میں اسلامک یونیورسٹی آف مدینہ جا کر مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یا پھر وہ خود اپنا دیوبند ادارہ قائم کر لیتے ہیں۔

آج نو ہزار سے زائد دیوبندی مدارس انڈیا، افغانستان اور پاکستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت پاکستان میں پشاور کے قریب واقع دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک کو ملی ہے جہاں ملاّ عمر اور افغانستان کے طالبان کے بہت سے دیگر رہنماؤں نے سب سے پہلے شریعت کے اصولوں کے مطابق زندگی کا لطف اٹھایا۔ عادل صدیقی ان ناموں کے ذکر پر واضح طور پر تناؤ کا شکار نظر آتے ہیں یہ نام اسلامی بنیاد پرستی کے مترادف بن گئے ہیں اور صدیقی صاحب اس روایت پر کار بند اداروں سے اپنے ادارے کو بڑی احتیاط سے الگ تھلگ کرنے کے ساتھ ہی ان کی سرگرمیوں کی مذمت سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ ''ہماری کتابیں وہاں پڑھائی جا رہی ہیں''، وہ کہتے ہیں۔ ''ان کا طریقہ کار اور اصول ایک ہی ہیں''۔ تاہم اگر کوئی دہشت گردی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو ایسا مقامی مجبوریوں اور سیاست کی وجہ سے ہے''۔

1877 میں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج، علی گڑھ کی بنیاد رکھنے والے سر سید احمد خان نے بھی ایک ایسے استاد سے تعلیم حاصل کی جن سے دیوبند کے بانیوں نے حاصل کی تھی۔ مگر ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ وہ جدید روایات اور تعلیمات اپنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے ادارے میں مذہب کو تعلیم سے علیحدہ کر دیا اور ہندوستان کے نئے سامراجی آقاؤں کی ثقافت بھی نصاب کا حصہ تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ سائنس، میڈیسن اور مغربی فلسفہ بھی پڑھایا جاتا تھا۔ ذریعہ تعلیم انگریزی تھا تا کہ طلباء کو سول سروس کی ملازمتوں کے لئے تیار کیا جا سکے۔ انہوں نے اپنے اسکول کو مشرق کا آکسفورڈ قرار دے دیا۔ صرف طرز تعمیر ہی اس نام کی بہترین عکاسی کر رہا ہے۔ کلاک ٹاورز، فصیلوں کے اوپر کنکرے لگے ہوئے مورچوں، مغلیہ محرابوں، گنبدوں اور وکٹورین اداروں کی باوقار قسم کی سرخ اینٹوں کا ایسا حسین امتزاج لئے ہے جو کہ ہندوستان میں یورپی اشیاء کے لئے بے پناہ جوش و پسندیدگی کے ماحول کا نتیجہ ہی ہو سکتا تھا، علی گڑھ کا مرکزی کیمپس آج کے دور میں ہندو، مسلمان طلبا و طالبات

کے انتہائی متنوع ہجوم کے لئے کسی جنت سے کم نہیں ہے۔ اس کے طب اور قانون کو شعبوں کا شمار بھارت کے صف اول کے شعبوں میں ہوتا ہے اور اسی طرح اس کے آرٹس کے شعبے کے اساتذہ اور قرآنی علوم کے مرکز بھی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ''اس سارے تنوع / رنگا رنگی، زبان ، ثقافت وغیرہ کے ساتھ بطور قوم آگے بڑھنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا سیکولرازم یعنی مذہب کی ریاست سے علیحدگی'' یہ علی گڑھ کے وائس چانسلر، کے عبدالعزیز کے الفاظ ہیں۔ اور ان کے بقول ''یہ نیا مذہب تھا''۔

مذہبی نظریئے میں پڑنے والی یہ دراڑ، یعنی آیا اسلام کو جدید نظریات اپنا لینے چائیں یا یہ کہ اسے پرانے بنیادی قوانین وضوابط کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، ان دونوں مکاتب فکر کے درمیان شروع میں اتنی وسیع نہیں تھی۔ مگر اگلے سو برسوں کے دوران یہ معمولی سی دارڑ پھیلتے پھیلتے دو ایسے مخالف اسلامی نظریات کی شکل اختیار کر گئی کہ جس کے اثرات دنیا میں آج تک شدت سے محسوس کئے جا رہے ہیں۔ تاہم اس دراڑ کے ایک بحران کی شکل اختیار کر جانے سے پہلے دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی رہنما ایک آزاد انڈیا کے مشترکہ مقصد پر اتفاق رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جب دونوں اداروں کے طلبا اور عملے کے ارکان ہندوؤں کے ساتھ مل کر نو آبادیاتی نظام کے طوق سے نجات حاصل کرنے کی جدو جہد میں مصروف تھے رو تدریسی رجحانات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

دو عقائد، دو قومیں

تاہم قوم پرستی کے رجحانات اس کمزور اتحاد پر منفی اثرات مرتب کر رہے تھے اور یوں برصغیر میں لسانی اور مذہبی تعریفیں زور پکڑنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک مشہور مسلمان شاعر اور مفکر علامہ محمد اقبال نے مستقبل کے آزاد ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی صورتحال کے حوالے سے سوال اٹھاتے ہوئے اسلام کی روح عصر (zeitgeist) کا تصور پیش کیا۔ اقبالؒ کے مطابق اس مسئلے کا حال یہ تھا کہ شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے، یعنی مسلمانون کے لئے ایک ایسا الگ وطن جہاں وہ اپنی خود مختار حکومت قائم کریں۔ یوں پاکستان کے تصور نے جنم لیا۔

ایک خوش پوشاک وکیل محمد علی جناح، جس نے کہ 14 اگست 1947 کو پاکستان کی پیدائش کے عمل کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ اس حوالے سے انتہائی شکوک وشبہات کا شکار تھا کہ اس نے جو آزاد ریاست حاصل کی تھی اس کا اصل تصور کیا تھا۔ تاہم جناح کے نجی سیکرٹری، شریف الدین پیرزادہ کے مطابق، اقبال اور جناح جو دونوں 1938 میں شاعر کی وفات تک دوست تھے، متواتر ایک ایسے خواب کا ذکر کرتے رہے جس کی عملی تعبیر ''ایک جدید، معتدل اور روشن خیال پاکستان' کی صورت میں نکلنی تھی۔

تاہم پاکستان کی تاریخ میں یہاں کے عوام نے شاذ ہی جناح کے تصور کے مطابق ایک جدید اسلامی جمہوریت کا تجربہ کیا ہو۔ ملک کی 62 برس کی تاریخ میں اقتدار کی پرامن اور جمہوری طریقے سے منتقلی صرف تین بار ہی عمل میں آئی ہے۔ چار عدد غیر مساوی صوبوں، درجن سے زائد زبانوں اور بولیوں، اور طاقتور ہمسایوں کے ہوتے ہوئے، ملک کے رہنماؤں کو، خواہ وہ صدور ہوں، وزیراعظم یا فوجی سربراہ، قوم کو متحد رکھنے کے لئے مجبوراً صرف ایک ہی مشترکہ عنصر کا سہارا لینا پڑا: اور وہ ہے مذہب۔

1971 کی خانہ جنگی کے بعد جب مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش، ملک سے علیحدہ ہو گیا تو مقبول عوامی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کو مزید لوٹنے سے بچانے کے لئے ایک نئی اسلامی شناخت کے پروگرام کا آغاز کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے 1977 بھٹو کا تختہ الٹنے کے بعد اسلامی قوانین کے نفاذ کا پروگرام جاری رکھا، اس امید پر کہ اس طرح سے اسے مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل ہو جائے گا جو کہ فوجی آمر کا واحد حمایتی حلقہ تھا۔ اس نے شرعی عدالتیں قائم کیں، مذہبی جذبات کی پامالی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور ایسے قوانین بنائے جن کے تحت زنا کی سزا کوڑے مقرر کرنے کے ساتھ ہی زنا بالجبر کا شکار عورت کو بدکاری کا مجرم قرار دیا جاسکتا تھا۔ جب دسمبر 1979 میں روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو پاکستان پہلے ہی سے اپنی طرز کے اسلامی انقلاب کے لئے پر تول رہا تھا۔

تقریباً راتوں رات، ہزاروں مہاجرین سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ گئے۔ مہاجرین کے لئے قائم کئے گئے کیمپ اور مدارس جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ واضح طور پر مہاجرین کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے یہ مدارس جنگجوؤں کی ایک نئی قسم یا کھیپ تیار کرنے کے حوالے سے اہم تربیتی مراکز

کے طور پر سامنے آئے: مجاہدین اسلام جو کہ امریکہ کے ایماء پر روس کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ میں کافر حملہ آوروں کا خاتمہ کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ ہزاروں پاکستانی بھی سرحد پار کر کے پوری دنیا سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ روسیوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ دور دراز کے علاقوں، حتیٰ کہ کراچی میں بھی ہائی اسکول کے بچوں نے جیبی صدری کی طرح کی وہ ''جہادی جیکٹیں'' زیب تن کر لیں جو مجاہدین میں بہت مقبول تھیں۔ پاکستانی خفیہ ادارے (Intelligence Agency) کے اس وقت کے سربراہ حمید گل کے بقول: ''1980 کی دہائی میں دنیا نے دیکھا کہ افغانستان کے لوگ ظلم و بربریت اور جبر کی طاقتوں کے خلاف کس طرح برسر پیکار ہو گئے تھے''۔ جہاد کا جذبہ از سر نو بیدار ہو چکا تھا، اور پاکستان کے نوجوانوں کو ایک نئے تصور سے روشناس کرا دیا گیا تھا۔

مگر جہاد، جیسا کہ قرآن میں، ذکر کیا گیا ہے، محض سیاسی فوائد حاصل ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ایک مکمل اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچتا ہے۔ مغرب اور پاکستان کی طرف سے یاسیت سے بھرپور ایک ایسے عمیق و طاقتور اور پیچیدہ قسم کے جذباتی تصور و عمل کو از سر نو بیدار کرنے کا نتیجہ ایک تو القاعدہ کی صورت میں سامنے آیا جو کہ افغانستان میں ایک خیالی اسلامی حکومت کے طالبانی خواب کو تعبیر عطا کر سکتی تھی اور دوسرے درجنوں ایسے اسلامی گروہوں کی صورت میں جو بھارت اور دنیا کے دوسرے حصوں میں تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ بقول حمید گل ''جہاد کا وعدہ یا مقصد کبھی پورا نہیں کیا گیا''۔ تو کیا اس میں کوئی حیرت ہے کہ لڑائی ابھی تک جاری ہے؟ مذہب کو پاکستانی ریاست یا معاشرے کی سلامتی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہوگا، مگر یہ اس کے اندر دراڑیں بھی ڈال رہا ہے۔

آج کا بھارت

بھارت میں اسلام دوسری طاقتوں کے ہاتھوں ایک بالکل ہی مختلف سلوک کا شکار ہے۔ برطانوی راج نے اسے تطہیر کے نام نہاد عمل سے گزارا، ہندو انتہا پسندوں نے اس کے بے حرمتی کی، اکثریت نے اس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا، اور معاشرے میں اسے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا گیا، انڈیا میں بھی تقریباً اتنے

* آکسفرڈ انگلش ڈکشنری سے (تدوین۔ جے سمپسن) آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے۔

ہی مسلمان ہیں جتنے کہ پورے پاکستان میں ہیں، مگر ایک ارب آبادی پر مشتمل قوم میں وہ ابھی تک اقلیت میں ہیں اور ان کو بھی دوسری اقلیتوں کی طرح بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ حکومتی اعداد و شمار دستیاب معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اوسط عمر کم، اقتصادی حالت ابتر، اور ہندوؤں کے مقابلے میں صحت کا معیار کم ہونے کے ساتھ ہی انہیں ملازمتیں بھی کم درجے کی عطا کی جاتی ہیں۔ البتہ ایک روزافزوں ترقی کرتی ہوئی معیشت میں مسلمانوں کی کامیابی کی داستانیں بھی منظر عام پر آتی ہیں۔ عالمی سطح پر اپنی خدمات پیش کرنے والے ایک عظیم الشان ادارے وائپر کا مالک عظیم پریم جی بھی کامیابی کی ایک ایسی ہی مثال ہے جس کا شمار بھارت کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ تاہم بہت سے مسلمانوں کے نزدیک دولت کی اس فراوانی میں عدم مساوات کے عنصر نے مسلمانوں کو مزید یکا و تنہا کر کے رکھ دیا ہے۔

مسلمان اکثریت کی ریاست، کشمیر جس کا مستقبل تقسیم کے بعد کے فسادات کے انتشار میں کسی فیصلے کے بغیر غیر واضح کر کے رکھ دیا گیا تھا، بھارت کی مسلم نفسیات کا ایک رستا ہوا زخم بن کر رہ گیا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان تین جنگوں کا سبب، جن میں سے ایک 1999 میں تقریباً ایٹمی جنگ کے امکان کی حامل تھی، کشمیر بھارتی مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ ان مسلمانوں کو یقین ہے کہ حکومت کشمیر کی آزادی کے اس دعوے کے حوالے سے سنجیدہ طرز عمل کا مظاہرہ نہیں کرتی جو کشمیر کے مستقبل کے یقین کے حوالے سے استصواب رائے کرانے کی اقوام متحدہ کی 1948 کی قرارداد پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے مایوسی و بے بسی کا احساس باقی ماندہ ہندوستان میں بے شمار دہشت گرد حملوں کی صورت میں سرایت کر چکا ہے اور یوں بھارتی مسلمان ایک ہی وقت میں مجرم اور مظلوم کا کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔

ظلم و ستم کی چکی میں پسے جانے کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے 2002 میں گجرات میں ہونے والے ظالمانہ، مسلم کش فسادات میں دو ہزار سے زائد افراد کی ہلاکت کے حوالے سے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے میں ہچکچاہٹ کے مظاہرے پر اشتعال کے نتیجے میں اندرون ملک جہادی تنظیموں کو پروان چڑھنے میں مدد ملی ہے۔ غیر قانونی تنظیم "سٹوڈنٹ اسلامک مومنٹ آف انڈیا" یا SIMI بھی ان میں سے ایک ہے جس پر

2003 میں ممبئی کے اندر 9 بم دھماکوں کا الزام عائد کیا جاتا ہے ان دھماکوں کے نتیجے میں 80 کے قریب ہلاکتیں ہوئی تھیں۔2006 میں ممبئی کے ٹرین دھماکوں کا الزام جن کے نتیجے میں 183 افراد ہلاک ہو گئے تھے، اس تنظیم کے علاوہ کشمیر کی حامی پاکستانی دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ (LeT) پر بھی عائد کیا جاتا ہے۔ ان واقعات نے ہندوؤں کے اس عمومی عقیدے کو عیاں کر کے رکھ دیا ہے کہ مسلمان حقیقت میں بھارتی شہری نہیں ہیں۔' [لشکر طیبہ یا ایس آئی ایم آئی میں کون ان واقعات کے پیچھے تھا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب (پرویز) مشرف کے بچے ہیں، ممبئی کے رہائشی منیش شاہ نے طنز کرتے ہوئے کہا جس کا ایک بہترین دوست ان دھماکوں کی نذر ہو گیا تھا۔ بھارت میں پاکستان کے برعکس اسلام متحد نہیں بلکہ متفرق کرتا ہے۔ تاہم، ابھی تک جنوبی ایشیا کے اکثر مسلمانوں کا یہی اصرار ہے کہ اسلام ہی وہ واحد طاقت ہے جو برصغیر کو متحد کرنے کے ساتھ ہی اس کی ایک سالم اکائی کی حیثیت سے عظمت رفتہ کو بحال کر سکتا ہے۔ ''ہم (مسلمان) ہندوستان کے قانونی حکمران تھے اور 1857 میں برطانویوں نے یہ ہم سے چھین لیا تھا۔'' ان خیالات کا اظہار اسلام آباد انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کے ایک خلیق عالم طارق جان نے کیا۔' 1947 میں انہیں یہ خطہ مسلمانوں کو واپس لوٹا دینا چاہئے تھا''۔ اگرچہ جان صاحب جنگجو نہیں ہیں مگر وہ سترھویں صدی کی بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کو دوبارہ ایک مسلمان حکومت کے تحت متحد دیکھنے کی شدید آرزو رکھتے ہیں۔

ناانصافی کا احساس آج کے مسلمان کی شناخت کے مسئلے کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔ یہ احساس زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرنے کے ساتھ ہی برصغیر میں بڑھتی ہوئی اسلامی بنیاد پرستی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان صحافی اور ایک نئی کتاب بہ عنوان ''ڈی سینٹ ان ٹو کیاس'' کے مصنف احمد رشید کے مطابق لوگ انصاف کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ ''اسے قرآن کا بنیادی اصول قرار دیا جاتا ہے''۔ یہ دو مظاہر یعنی مسلمانوں کی اکثریت کی برصغیر کے اندر اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے لئے تڑپ اور اسلام کے چہرے پر تقدیس وانتہا پسندی کے نشانات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ایسے مضبوط سماجی وسیاسی اداروں کی اشد ضرورت ہے جن پر لوگ اعتماد کر سکتے ہوں، اگر برصغیر کی حکومتیں یہ ادارے نہیں قائم کر سکتیں تو ترشول (Trident) کے پراسرار پکارنے والے کی طرح دہشت گرد سوالات کی بوچھاڑ جاری رکھیں گے۔ اور ان کے جوابات بھی

خود ہی دیتے رہیں گے۔

کئی زمانوں کے سمندری مسافر

پیکو آئر ۔ دبئی

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ چین میں اس نے کسی غار میں رہنے والے کا قصہ سنا جس کی عمر دو سو برس سے زائد تھی اور جس نے نہ تو کبھی کھایا تھا، نہ پیا تھا اور نہ کچھ بولا تھا۔ اسے دریافت کرنے کے بعد یہ نڈر اور بے باک مراکشی مسافر اس جوگی یا سیانے کو اپنا ہاتھ تھامنے اور سونگھنے کے بعد یہ اعلان کرتے سنتا ہے، ''یہ آدمی اس دنیا سے اتنی ہی رغبت رکھتا ہے جتنی کہ ہم اگلی دنیا سے''۔ اس کے ساتھ ہی اس معمر تارک الدنیا نے بظاہر نہ بولنے کی اپنی قسم کو توڑتے ہوئے اپنے ملاقاتی کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس سے پہلے بھی مل چکے تھے اور پھر دوبارہ غار کے اندر چلا گیا کبھی نہ نظر آنے کے لئے۔

ایک پارسا اور تربیت یافتہ مجسٹریٹ کے طور پر ابن بطوطہ نے یہ پریشان کن واقعہ ایک مقامی جج یا قاضی کو سنایا اور اس تاجر کے بارے میں سنا جو اس سے قبل اس جوگی سے مل چکا تھا، اور خود کو چشم تصور میں ایک بڑے سے محل میں سونے کا تاج پہنے کسی شیخ کے سامنے پانے کے علاوہ ایسے پھلوں کو دیکھ چکا تھا جو ''کسی ندی میں گرتے نظر آ رہے تھے'' اور پھر تصوراتی پھلوں کو کھانے کے بعد کئی ماہ تک بیمار رہا تھا۔

یہاں شاید آپ کو ابن بطوطہ کی چھوٹی شبیہ نظر آ رہی ہے: اسرار اور درستگی کا حسین امتزاج، علامات اور عجائبات کا مبنی بر حقیقت بیان زندگی کی دل لبھانے والی تفصیلات کے ساتھ اور اس کے مشہور زمانہ سفر کے اختتام کے650 برس کے بعد بھی اگر ہم اس کو پڑھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا طرز عمل، سفری مشکلات اور انداز تحریر بالکل ویسے ہی نظر آتے ہیں جن کا کہ ہم آج کے دور میں بھی تجربہ و مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ تاہم ان مماثلتوں کے باوجود اس کی ناقابل اصلاح شخصیت اور ایک دنیا کی تفصیلات کے منفرد انداز میں بیان کا اپنا الگ ذائقہ ہے۔

ابن بطوطہ اپنے آبائی قصبے طنجہ سے1325 میں ایک سچے صوفی یاتری اور ایک طرح سے مذہبی ماہر بشریات کی حیثیت سے اس مقصد کے ساتھ روانہ ہوا تا کہ مقدس مقامات کے ساتھ ہی اولیاء کرام اور ان سے منسوب فخر اور عقیدت کی ان داستانوں کو بھی تحریری طور پر محفوظ کر سکے جنہیں اس نے مکّہ کی طرف اپنے سفر کے دوران دریافت کیا تھا۔ تاہم ڈیڑھ برس کے اندر حج مکمل کر لینے کے بعد اس نے مزید28 برس تک اپنا سفر جاری رکھا۔ جیسا کہ تمام بہترین سیاحوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایک سفر کرنے کے عمل سے آغاز کرتا ہے اور بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ سفر اس کے اوپر غالب آ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ محض ایک مسلمان زائر کی وہ پیشرفت نہیں تھی جس کا اس نے ارادہ کیا تھا بلکہ عجائبات کے بیان کا ایک عالمی مجموعہ نثر۔ ابن بطوطہ نے ایک ایسے مثالی نمونے (archetype) کے لئے آواز بلند کی جو ہمیں آج بھی ہر طرف نظر آتا ہے حتیٰ کہ آج کے کھوج بذریعہ نقشہ (MapQuest) عہد میں بھی۔

رحلہ یا سفرنامہ اس دور کے شمالی افریقہ میں ایک عمومی طریقہ تھا جو کہ سلاطین استعمال کرتے تھے تا کہ واپس اپنے وطن میں جا کر عوام کے اندر ایک اسلامی بھائی چارے اور عبادت کے عظیم بین البراعظمی سلسلہء روابط کا احساس اجاگر کر سکیں۔ ابن بطوطہ کوئی بھی غیر معمولی کام نہیں کر رہا تھا جب اس نے قانونی محققین پر مشتمل اپنے خاندان کو الوداع کہا تھا، بالکل اس طرح جیسے چار صدیوں بعد امیر گھرانوں میں پیدا ہونے اور اعلیٰ درجے کے سماجی روابط رکھنے والے انگریزوں کی روایت تھی جنہوں نے کہ پیرس، فلورنس اور وینس جیسے عظیم علمی و ثقافتی مراکز کا دورہ کیا تھا۔ (اگرچہ ابن بطوطہ دمشق، قاہرہ اور مدینہ کو عازم سفر ہوا تھا)۔ وہ دارالسّلام میں جہاں کہیں بھی گیا اس کی ملاقات اپنے جیسے ماہرین قانون سے ہوئی جنہوں نے اس کی شاندار مہمان

نوازی کرتے ہوئے کنیزیں اور خادم بھی عطا کئے اور بعض اوقات اسے سفر کے لئے ساتھی بھی تلاش کر کے دیئے۔

اور اس کے باوجود اگرچہ وہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سفر پر نکلا تھا، مگر اس حقیقت کے مدنظر کہ وہ مسلسل سفر کرتا رہا اپنے اصل آزمائشی پروگرام سے بھی بڑھ کر، اس امر کی یقین دہانی حاصل ہوگئی کہ اس کے کارنامے اکثر پراسرار طور پر آج کے دور کے سیاح کے بے شمار کارناموں سے مطابقت رکھتے ہیں: اسے ملیریا ہوگیا، اس نے دیکھا کہ اس کے گائیڈ اسے دھوکہ دے رہے ہیں، اور ایک موقع پر اس نے دیکھا کہ وہ چینی کشتی جس پر وہ سوار ہونے لگا تھا سمندر میں ڈوب گئی جبکہ ایک دوسری کشتی جس پر اس کا غلام اور کنیزیں (جن میں سے ایک کے پیٹ میں اس کا ان جنا بچہ بھی تھا) سوار تھیں کسی نامعلوم بندرگار کی طرف روانہ ہوگئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر ڈاکو غلبہ پالیتے ہیں، وہ حملہ آوروں سے بچنے کے لئے کسی گڑھے کے اندر چھپ جاتا ہے، وہ قاہرہ سے گزرتا ہے جہاں وبا کی وجہ سے روانہ اکیس ہزار افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

ایک عجیب نئی دنیا

چنانچہ وہ آدمی جو اپنی روئداد کا آغاز ایک ''حوصلے مذہبی یقین اور انتھک ہمت و استقلال'' کے طور پر پیش کردہ شکل سے کرتا ہے، صوفیا کی دانش کے قصے تحریر کرتے ہوئے وہ اسے کوئی غیب دانی کے انداز میں یہ کہتا ہے کہ وہ دور انڈیا اور چین میں اپنے رفقائے کار سے جا کر ملاقات کرے اور لیجئے، نوجوان سیاح یہی کچھ کرتا ہے۔ مختلف مقامات کے آنکھیں کھول دینے والے ایسے قصے اور کہانیاں بیان کرتا ہے جو اس کے قاری کو لازماً حقیقت سے اتنے دور نظر آتے ہوں گے جتنا کہ چاند۔ وہ ایک جادوگر کا ذکر کرتا ہے جو ''ایک مکعب یا چوکور شکل میں ڈھل جاتا ہے اور زمین سے اوپر اٹھ جاتا ہے'' اور ایک ایسی عورت کا جو اپنی نظروں سے مردوں کو قتل کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی؛ وہ ایک ایسے آدمی کو دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے جو حکمران وقت سے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا ہی سر کاٹ دیتا ہے اور وہ محل جو اس طرح تعمیر کیا گیا تھا جو کوئی بھی اس میں داخل ہوتا تو کسی ہاتھی کے ٹکرانے کی صورت میں وہ اس کے اوپر گر جاتا ہے۔ الف لیلہ کی داستانوں کا ایک طرح سے الٹ مجموعہ تیار کرتے ہوئے ابن بطوطہ آج کے ان ہزاروں سیاحوں کی طرح تھا جو بڑی

بے تابی سے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اپنی مطلوبہ منزل پا لینے سے گم ہو جانا زیادہ مفید ثابت ہوا۔

ایک اور خوبی جو اس میں نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جس جگہ بھی جاتا ہے اسے (جیسا کہ بہت سے سیاحوں کا وطیرہ ہے) اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق نئے رنگ میں رنگے بغیر نہیں رہتا۔ جب کریمیا میں کیتھولک چرچ کی گھنٹیوں کی آواز اس کو ناگوار گزرتی ہے تو وہ بھاگ کر مینار کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور با آواز بلند قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دیتا ہے۔ مالدیپ میں ایک مجسٹریٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتے ہوئے وہ ایک ایسا نظام متعارف کرواتا ہے جس کے تحت جمعہ کی نماز کے اجتماع میں شامل نہ ہونے والے مردوں کو ''سر عام کوڑے مارے اور ذلیل کیا جاتا''۔ مالے میں ایک سلطان اسے جب تحفہ دینے سے انکار کر دیتا ہے تو ابن بطوطہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کا ذکر بہت منفی انداز میں کرے گا (سلطان فوراً ہی اسے ایک مکان عطیہ کر دیتا ہے)۔ دہلی میں جب اسے موت کی سزا سر پر منڈلاتی نظر آئی تو اس نے ایک دعا 33000 بار پڑھی تو اس کی جان بچ گئی۔

جیسا کہ راس ڈن اور دوسرے محققین نے نکتہ اجاگر کیا ہے، ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے کے کچھ اقتباسات (اور ایسا صرف اس نے ہی نہیں کیا) ہو بہو اپنے دور سے پہلے کے مسلمان سیاحوں کے سفر ناموں سے چرا لئے ہیں؛ اہراموں کے بارے میں اس کا تذکرہ اس قدر مبہم سا ہے کہ (جیسا کہ مارکو پولو نے کیا) یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اہرام یا دوسری بیان کی گئی جگہیں کبھی دیکھی ہی نہیں ہوں گی۔ بہت سی جگہوں پر واقعات کی ترتیب فہم سے بالکل ہی بالاتر ہے، اور مراکش سے واپسی پر اپنی کتاب، بظاہر تحریری یادداشتوں کے بغیر، کسی نوجوان اندلوسی عالم کو سناتے ہوئے، جس سے اس کی ملاقات گریناڈا میں ہوئی تھی، وہ یا تو بہت سی تاریخیں بھولتا نظر آتا ہے، یا پھر پروٹو بروس چیٹ ون کی طرح قصہ خوانی کے مفاد میں خود ساختہ و جامع واقعات گھڑتا اور اختصار سے کام لیتا نظر آتا ہے۔

اب ہم مخصوص قسم کی عملی معلومات یکجا کرنے اور ان کی بے شمار تفصیلات کی غیر متوقع درستگی کے حوالے سے مارکو پولو کی طرف رجوع کرتے ہیں؛ ہم ابن بطوطہ کو پڑھتے ہیں جو مارکو پولو کی وفات کے ایک برس بعد سفر کا آغاز کرتا ہے تاکہ اس کی بار بار انحراف کرنے کی عادت اور اس کی اکثر و بیشتر مشرقی اقتدار کی طرف مائل ہو جانے والی شخصیت کو جان سکیں۔ مثال کے طور پر

بھارت میں وہ بہت سے ملنے والے لوگوں کو ''کافر'' بنانے اور یہ بیان کرنے کے لئے کہ کس طرح ایک نابینا آدمی کو دس روز تک پاؤں کے بل گھسیٹا جاتا رہا اور سزایافتہ لوگوں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچلوا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، ضرورت سے زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔ مالدیپ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ وہ بہت سی عورتوں کو راستے میں ہی بیوی بنا لیتا ہے (صرف چھ عورتیں تو وہ ہیں جنہیں وہ وہیں چن لیتا ہے) اور اس کے اتنے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک وزیر ابن بطوطہ کے تیزی سے وسعت پذیر ہوتے ہوئے قبیلے کے تصور سے ہی لرز کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ قدرتی انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق مجھے اس موسم بہار میں مشرق وسطیٰ کی کتابوں کی ایک بہت بڑی دوکان میں اس کے سفر نامہ اول کا جو واحد انگریزی احوال نظر آ سکا تھا وہ 1829 کا وہ ترجمہ تھا جس کی کاٹ چھانٹ وترتیب برٹش ریو اور (کیمبرج میں عربی کے پروفیسر) سیموئیل لی نے کی تھی، اس میں صفحات کے آخر میں جو نوٹس یا نکات درج کئے گئے تھے وہ ابن بطوطہ کے بارے میں اس طرح کے واشگاف اور واضح حوالہ جات سے پر تھے جن کے مطابق ابن بطوطہ ''وہمی'' اور عجائبات کے تذکروں کا عادی تھا۔

ہم جب اس کی کتاب رحلہ کا آج مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ چنگیز خان کو جس کی یادداشتیں ابھی اس وقت تازہ ہی تھیں جب ابن بطوطہ لکھ رہا تھا، کسی طرح ایک ''آزاد خیال، طاقتور اور فربہ شخص'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے: یمن جو کہ ان دنوں انتشار آمیز غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے، اس کے بعض حصوں میں ''ہر طرح کی اجناس کی بھرمار ہے''۔ مسلمان سیاح کے لئے چین ''دنیا کا محفوظ ترین اور انتہائی پسندیدہ یا موافق ملک'' تھا، اگرچہ ابن بطوطہ اس کے لادینی نظریئے کی بناء پر اکثر اس طرف جانا گوارا نہ کر سکتا تھا۔ جس طرح کسی بھی ''جیسا کہ بتایا گیا'' قسم کے احوال میں ہوتا ہے یہ جاننا مشکل ہے کہ بالکل درست طور پر ایک رسمی مصنف کے ساتھ کیا منسوب کیا جا سکتا ہے اور اس کے جعلی مصنف کے ساتھ کیا، مگر وہ تجسس جو ابن بطوطہ کو مسلسل آگے دھکیلتا ہے اس وقت بھڑک اٹھتا ہے جب مکہ کے دورے کو ایک ہی فقرے میں بیان کر چکنے کے بعد وہ موغا دیشو کے کھانوں کو طویل پیرائے میں بیان کرتا ہے، بھنے ہوئے بہشتی کیلے کے پھل کو نئے دودھ میں ابال کر اور گرم مصالحے کے نمک اور اچار میں ڈبوئے ہوئے دانوں'' اور

انگور اور سبز ادرک کے ساتھ پیش کرنا۔

دائرہ مکمل کرنا

اور میں ابھی جس وقت انتھونی بوردین جیسی قدر کے حامل یہ اقتباسات پڑھ رہا تھا تو میں نے خود کو اتفاق سے ابن بطوطہ مال، دبئی میں پایا۔ فلپائنی لوگ ایک دوکان کے باہر دھاری دار تہمدوں (sarongs) سے ماڈلنگ کر رہے تھے۔ ایک دوستانہ انداز کے حامل انڈین نے مجھے ایسے سمعی لسانی نمونے تیار کرنے کے لئے کہا جن کی مدد سے میں دری اور البانین اور کوچوآ (Qnechua)، حتیٰ کہ ''امریکن زبان'' میں بھی روانی حاصل کر سکوں۔ ٹونی روماز (جس کے احاطے کی دوسری طرف پیزا ایکسپریس تھا) سے متصل ایک ایرانی ریسٹورنٹ تھا۔ چھ عدد وسیع جغرافیائی اکائیوں (zones) کو ایسے علاقوں کی ساتھ منسوب کر دینے سے جن کی ابن بطوطہ سیاحت کر چکا تھا اور مرکزی حصے (سٹاربکس سے بالکل ساتھ اور نائین ویسٹ سے دوسری طرف) کو خود ابن بطوطہ کے نام کر دینے سے مال ہر طرح سے اس کے سفر کے انوکھے راستوں اور تفصیلات کے ساتھ ہی اس کے ذوق تجسس کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی تھی۔ تاہم پھر بھی اس پار سا مسلمان کی عمیق یادوں نے میرے اندر عین دوپہر کے وقت سر ابھارا: اذان کی آواز چمکتی دمکتی راہداری کے اندر سے ہوتے ہوئے باڈی شاپ اور شپسی جپسی سٹور پر سے گذرتی ہوئی لافنگ بدھا سٹال اور ڈیجیٹل تھری۔ ڈی میں سپیس چمپس دکھانے والے 21۔ سکرین سینما تک پھیلتی چلی گئی۔ کچھ دیر کے لئے، ایک کھڑکی میں ایلویس کی نمائشی جھلک پر ایک زیادہ لافانی یا دائمی حقیقت غالب آ گئی تھی۔ اور پھر ان تمام ثقافتوں نے بھی جن کی نمائندگی ہر دوسرا خریدار اور دوکاندار کرتا نظر آتا تھا، اس دھن کے پکے مراکشی کے سفر کو جذبہ اور مقصدیت عطا کی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی نہ کی ہو، میں نے سوچا مگر ابن بطوطہ نے وہ کام کر دکھایا تھا جس کا بڑے بڑے یقیناً خواب ہی دیکھتے ہوں گے: وہ ایک مقام بن چکا تھا خود اپنی ذات میں ایک منزل۔

☆☆☆☆☆

ہانگژو کا لافانی پیغام

مائیکل ایلیٹ

گزشتہ برس خزاں کے ایک خوبصورت دن میں چین ژہجیانگ کے شہر ہانگژو کی عقبی گلیوں میں رہڑی کے پیسوں جتنی سانپ چھتریوں، سانگ بادشاہت کے زمانے کے مخصوص لباس تن زیب کئے اور تصویریں کھنچواتے سیاحوں سے بھرے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گزر رہا تھا جب میری نظر ان لوگوں پر پڑی جو بڑی تیزی سے ایک پرسکون اور باوقار عمارت کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں ایک منٹ لگا کہ یہ ایک مسجد تھی، ہانگژو کی فوئینکس نام کی مسجد جس کی بنیاد ایک ہزار برس قبل تانگ بادشاہت کے زمانے میں رکھی گئی تھی۔

ہر ممکن طور پر یہ وہی مسجد تھی جس میں ابن بطوطہ نے 1340 کی دہائی میں اپنے ہانگژو کے دورے کے وقت نماز پڑھی تھی۔ اس نے شہر کی وسعت اور دلکشی کا تذکرہ بھی کیا ہے، ہانگژو آج اس وقت بھی ایک خوبصورت جھیل کے کنارے نرم و سرسبز پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے، اور وہ اس کی خوبصورتی بیان کرنے والا پہلا سیاح نہیں تھا۔ اس سے 50 برس پہلے شہر وینس سے تعلق رکھنے والا ایک باشندہ مارکو پولو بھی اس جگہ پر وقت گزار چکا تھا اور اس کی تعریف یوں مترنم انداز میں کرتا ہے "بلاشبہ دنیا کا سب سے بہترین اور شاندار شہر"، اور واقعی یہ حقیقت ہے۔

ابن بطوطہ کے اس دورے کے کوئی 60 برس بعد ہانگژو کے عجائبات کی تعمیر کے پس پردہ ثقافت نے اپنی ہی نوعیت کی سفری مہمات کی حوصلہ افزائی کی: بے مثال ہمت و شجاعت و خطرات

سے پر 7عدد ایسی تاریخی سفری مہمات جن کی قیادت عظیم بحری کمانڈر زینگ حی نے کی تھی اور جو بحرالکاہل سے لے کر افریقہ کے سواحلی ساحلوں تک محیط تھیں۔ مجھے اس حوالے سے تو کوئی یقین نہیں ہے کہ زینگ حی نے کبھی ہانگژو کا دورہ کیا تھا یا نہیں (اس کے منشی ماہوآن کا تعلق ہمسایہ قصبے شاؤ ژنگ سے تھا)، مگر اس کی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امکان نظر آتا ہے کہ اس نے دورہ کیا ہو گا۔ اس صورت میں مغربی جھیل پر واقع شہر ایک ایسا مقام تھا جس سے تینوں عظیم مہم جو واقف تھے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم چینی شہر تھا جو تینوں سیاحوں کے درمیان ایک قدر مشترک تھا، بہ نسبت شمال مغربی یورپ کے ایک ایسے شہر کے جیسے لندن یا پیرس جو کہ 14 ویں صدی میں تاریک کوٹھڑیوں کے خطرناک و پریشان کن مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں تھے، اور جس کے تاجر اور مفکر بحرالکاہل کے مرکز میں اس کے طویل آغاز کے ساتھ ہی دنیا کو ایک نئے انداز سے روشناس کرنے والے تھے۔

اس کے علاوہ یہ چینی شہر عالمگیر ثقافت کا حامل بھی تھا۔ وہاں صرف مسلمان ہی زیادہ تعداد میں آباد نہیں تھے؛ ابن بطوطہ ذکر کرتا ہے کہ وہاں یہودی لوگ بھی آباد تھے، اس کے علاوہ یقیناً وہاں بھارت سے نقل مکانی کر کے آنے والے بدھ مت کے لوگ بھی کثیر تعداد میں موجود پائے جاتے تھے اور پھر نصرانی (Nestorian) عیسائی بھی جنہوں نے یوآن بادشاہت کے دور میں بہت ترقی کی۔

یہاں ہمارے لئے واضح سبق موجود ہیں۔ ان تین مہم جو سیاحوں کی زندگیاں ہمیں اس امر کا احساس دلاتی ہیں کہ ہم جیسے جدید دنیا تصور کرتے ہیں جہاں اٹلانٹک ٹیکنالوجی اور علمی تجسس کا راج ہے، وہاں پر موجود واحد دنیا نہیں تھی، اور اقتصادی طاقت کے جنوب اور مشرق کی طرف منتقل ہونے کے ساتھ ہی، یقیناً وہاں کی اکلوتی دنیا نہیں رہے گی۔ چین کا عروج کی طرف متواتر سفر آگے بیان کی جانے والی کہانی کا حصہ ہے۔ تاہم ہانگژو ہمیں اس امر کی یاددہانی بھی کراتا ہے کہ جب چین دنیا کی عظیم ترین طاقت تھا تو یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جو دنیا کی تمام معلوم ثقافتوں کے اثرات کو جذب کرنے پر تیار تھا۔ یہ بعض اوقات چینی حکام اور چین کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ حلقوں دونوں کے مفاد میں ہوتا ہے کہ وہ پاک اور مغربی ثقافت سے جدا اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ ایک بالکل ہی لغو بات ہے اور ہانگژو ایک ایسی جگہ جو ہمیں اس حقیقت

کا احساس دلاتی ہے۔

حتمی بات یہ ہے کہ اپنی لسانی مہارتوں سے ہٹ کر ان تین میں سے دو آدمیوں کو آپس میں بات چیت کے حوالے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہوگی۔ طنجہ سے تعلق رکھنے والا قانون دان ابن بطوطہ اور دس ہزار کلومیٹر کی دوری پر واقع ینان (Yunnan) سے تعلق رکھنے والا فوجی زینگ حی دونوں مسلمان تھے جو ایک ہی خدا اور ثقافت پر یقین رکھتے تھے۔ گزشتہ 25 برسوں سے ہم اس کا ہلا نہ سوچ کا شکار چلے آرہے ہیں کہ دنیا کو ایک عالمی گاؤں کی صورت میں صرف اور صرف اقتصادی، کاروباری اور مالیاتی مفاد کے ذریعے ہی متحد رکھا جا سکتا ہے اور عالمگیریت کا یہی مطلب لیا جاتا ہے، مگر یہ اس دور کا سچ نہیں ہے اور اس دور میں بھی نہیں تھا جب سو برس کے اندر اندر ایک دوسرے کے آگے پیچھے، جیسا کہ ہم تصور کر سکتے ہیں، ابن بطوطہ، مارکو پولو اور زینگ حی تینوں میں سے ہر ایک نے پورے چاند کی رات آسمان کے طرف تکتے ہوئے بذریعہ کشتی مغربی جھیل کی راہ لی اور اپنے سفر کا راستہ یاد رکھتے ہوئے انہیں علم تھا کہ دنیا ایک ہی ہے۔

ایک اسلامی مہم جوئی

مائیکل ایلیٹ

اگرچہ طنجہ میں واقع اپنے گھر سے روانہ ہوتے وقت ابن بطوطہ نامی قانون دان کو یہ خبر نہیں ہوگی کہ وہ صحارا سے لے کر چین کے ساحلوں تک ہر جگہ کی سیاحت کے 29 سالہ سفر کا آغاز کر رہا ہے: تاہم وہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں اسے ایک مستقل عنصر ضرور ملا: یعنی اسلامی ثقافت اور عقیدے کا مشترک عنصر جس نے پوری دنیا کو اس وقت بھی ایک بندھن میں باندھ رکھا تھا جب ابھی لفظ گلوبلائزیشن کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ عرب بہار کا کھیل ابھی تک جاری رہنے کے ساتھ ہی اسلامی دنیا کو درپیش تبدیلیوں اور آزمائشوں کے مدنظر ابن بطوطہ کی سیاحتیں ایک ایسا مکمل اور جامع موضوع نظر آ رہا ہے کہ جس کے ذریعے ہم یہ دیکھنا اور جاننا چاہتے ہیں کہ اس وقت سے لے کر اب تک دنیا کتنی تبدیل ہو چکی، اور کتنی ویسی کی ویسی ہے۔

ہمارے مراسلہ یا نامہ نگار جیسا کہ اس منصوبے یا پراجیکٹ کے حوالے سے ان کی روایت چلی آ رہی ہے، ہر اس موقع سے استفادہ کرنے کو لپکے جس سے ان کو کوئی سنجیدہ مواد ملنے کی امید نظر آئی۔ ایلکس پیری صومالی قزاقوں کی تلاش میں سرگرداں رہا (صاف ظاہر ہے کہ ایلکس ہونے کی وجہ سے اسے کچھ قزاق مل گئے) جبکہ لیزا آبند نے اندلس کے زوال کے کوئی 500 برس بعد سپین میں پیدا ہونے والے شناخت کے نئے بحران پر سوچ و بچار کی۔ کارل وک نے استنبول کو

کھنگال مارا جبکہ ارین بیکر چند ایک شرکاء یا انٹرویو کیے گئے حضرات کے مشاہدے یا آراء کو بھی جگہ دیتے ہوئے سعودی عرب میں رومانی ملاقاتوں کے منفرد طریقہ کار کا جائزہ لیا، اور فوٹوگرافر ڈومینیک ناہر نے صحارا کی ریت اور پانی کے مناظر کو مرکز نگاہ بنایا۔

ہفت روزہ ٹائم کے اس شمارے کی کانٹ چھانٹ(editing) کا فریضہ ہانگ کانگ میں عبدالکریم اور نیویارک میں بوبی گوش کے تجربہ کار ہاتھوں میں دیا گیا۔ (بوبی بے معتدل سیاسی اسلام کے عروج کے حوالے سے زبردست قسم کا مضمون لکھ کر دوہرا فریضہ انجام دیا)۔ پیٹرک وکی نے فوٹوگرافی کے کام کی نگرانی کی، پیٹر جونز نے نقشہ سازی کی اور عمدہ و باوقار قسم کا خاکہ یا شکل ہمارے انٹرنیشنل آرٹ ڈائریکٹر وکٹر ولیم کا کمال تھا۔ چنانچہ اس طرح کے شمارے کے لئے یہ انتہائی ضروری تھا کہ ترجیحات اور حتمی وقت کا تعین کیا جائے، خوش قسمتی سے ہمارے پاس اس مقصد کے لئے اینڈریا ڈرافمین موجود تھی۔ میں اس سب کا شکرگزار ہوں۔

سمر جرنی (یا گرمیوں کا) شمارہ مرتب کرنا میرے لئے ہمیشہ ہی سال کا خصوصی وقت ثابت ہوا ہے۔ یہ میری طرف سے تیار کردہ آٹھواں شمارہ ہے اور آخری بھی ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ٹائم انٹرنیشنل کا میرے ہاتھوں مرتب کردہ آخری شمارہ ہے۔ میں ون(One) کے صدر اور سی ای او کے طور پر جو کہ انتہائی غربت اور قابل احتراز بیماریوں کے خاتمے کے لئے کام کرنے والا ایک عالمی مشاورتی ادارہ ہے، ایک نئی ملازمت کا آغاز کرنے والا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ ٹائم میں بہت سے ذہین صحافی، مرد عورتیں جو کہ آپ تک خبریں پہنچانے کے لئے صبر آزما حالات میں بھی انتھک محنت کرتے ہیں، میرے رفیق کار رہے ہیں۔ اور اب میں آپ کے بلند و بالا مراتب میں شامل ہونے کی امید کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔

☆☆☆☆☆